انوکھے سنسار کی انوکھی باتیں: از جناب بدیع الزماں اعظمی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۱۰۰ مجلد مع گرد پوش قیمت: للعہ غیر مجلد ۳ے، پتہ از مصنف ۱۴۰، کرمی ٹولہ، اعظم گڈھ، یو۔ پی۔

جناب بدیع الزماں اعظمی ریٹائرڈ ٹیچر ہیں، درس و تدریس کے علاوہ ان کو بچوں کی ذہنی تربیت سے بھی بڑی دلچسپی ہے، اس غرض سے وہ برابر مضامین، ڈرامے اور کتابچے لکھتے رہتے ہیں، انھوں نے اس مصور کتاب میں دنیا کی انوکھی اور دلچسپ باتیں عام فہم زبان میں لکھی ہے، پہلے زمین آسمان، ستاروں، سیاروں، قدیم بری و بحری جانوروں، پرندوں، مکانات، اور رسم و رواج کا دلچسپ ذکر ہو پھر ہندوستان میں پنج سالہ منصوبوں کے درمیان بنائے گئے باندھ، جھیلوں، بجلی گھروں نہروں اور بڑے بڑے کارخانوں کے متعلق مفید معلومات قلمبند کی گئی ہیں آخر میں آنیوالی اکیسویں صدی کے بارہ میں بعض دلچسپ پیشین گوئیاں ہیں، یہ مفید اور پرُ از معلومات کتاب سکولوں کے طلبہ کے مطالعہ میں شامل کئے جانے کے لائق ہے،

اجالے از جناب کالیداس گپتا رضا صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت طباعت عمدہ صفحات ۸۰ مجلد مع گرد پوش قیمت غ/ پتہ دل پبلیکشنز، ۷/۱، اجولی بھون نمبر ۱، انیو مرین لائن چرچ گیٹ بمبئی نمبر ۲۰،

جناب کالیداس رضا گپتا مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں اجالے ان کا نیا مجموعۂ کلام ہے اس میں پہلے نعتیہ کلام اور آخر میں حضرت حسینؓ کی منقبت و شہادت سے متعلق اشعار ہیں، لیکن بعض اشعار غیر موزوں، اور کہیں کہیں زبان و انداز بیان عجیب ہے، مثلاً:۔

تھی یہی شانِ محمد کہ رسالت پاکر ساری مخلوق کو قرآن کے جھلائے جھولے ص ۲۱

اے حسین آلِ نبی، ابن علی، ذبح عظیم عالم شعر سے منظور ہو شاعر کا سلام ص ۵۴

ذبح عظیم کے بجائے صاحب ذبح عظیم اور منظور کے بجائے مقبول کہتے تو کچھ بات بنتی، پھول (ص ۶۶) کو مونث لکھا ہے، قیمت بھی زیادہ ہے،

"ض"

جلد ۱۲۰ ماہ جمادی الثانی ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۷ء عدد ۶

مضامین

شذرات

گذشتہ مہینہ لکھنؤ میں حلقۂ پیام انسانیت کا ایک کل ہند کنونشن ہوا، اس کے بانی اور روح رواں ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا ابوالحسن علی ندوی ہیں، جو اپنے انسانی اخلاق کی بلندی کردار کی پاکیزگی اور محبوب شخصیت کی دل آویزی سے قرون اولیٰ کے بزرگوں کی یاد تازہ کرتے ہیں، وہ اب سے تین سال پہلے ملک کی بگڑتی ہوئی صورت اور انسانی اور اخلاقی قدروں کی پامالی سے بہت دلگیر ہوئے تھے تو انھوں نے حلقۂ پیام انسانیت قائم کیا تھا جس کے ذریعہ سے ہندستان کے شہریوں اور خصوصاً مسلمانوں کو للکار کر ان کو انسانیت اور اخلاق کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کی ممکن ہے کہ اُن کی آواز ہندوستان کے عام شہریوں تک نہ پہنچی ہو، لیکن مسلمانوں کو اُن کے پیام کو لازمی طور پر اپنانا ہے، اس برصغیر میں بنگلہ دیش اور پاکستان کے مسلمان تو اپنے سارے مسائل دینی حکومتوں کے ذریعہ سے طے کر سکتے ہیں، مگر ہندستان کے مسلمانوں کو اب سلاطین دہلی یا مغل بادشاہوں کی طرح یہاں کی حکومت حاصل نہیں ہو سکتی ہے، جو مسلمان قومی دھارے کا ساتھ دیتے رہیں گے اُن کو بڑے سے بڑا عہدہ بھی ملتا رہیگا، یا مختلف ریاستوں میں ان کو وزارت میں کچھ حصہ بھی دیا جاتا رہیگا، مگر ان افراد کے معزز عہدوں سے مسلمانوں کی اجتماعی مشکلات دور نہیں ہو سکتی ہیں، پھر سوال یہ ہے کہ وہ کریں تو کیا کریں، اُن کو کوئی الہ دین کا چراغ بھی نہیں مل سکتا ہے جس سے وہ اپنے مذہبی، سیاسی، عمرانی اور معاشرتی مسائل کو حل کرتے رہیں،

مگر الہ دین کے چراغ سے بڑھ کر ان کے اخلاق، کردار اور سیرت کا چراغ ہے بشرطیکہ وہ خود اس کو روشن رکھیں، وہ اچھے انسان بن کر اپنی ہر قسم کی مشکلات کو دور کر سکتے ہیں، اور اس ملک کے قومی دھارے پر بھی اجتماعی طور سے اثر انداز ہو سکتے ہیں، اگر وہ سچے مسلمان بن جائیں تو اچھے انسان خود بخود بن جائیں گے،

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب بیت المقدس فتح ہوا تو اس کے فاتح حضرت ابو عبیدہؓ نے ان کو وہاں آنے کی دعوت دی، جب وہ وہاں داخل ہو رہے تھے تو اُن کے معمولی لباس اور بے سروسامانی کو دیکھ کر مسلمان شرمائے کہ عیسائی ہنسیں گے، اس لئے انھوں نے اپنے امیر المومنین کو ترکی گھوڑے اور قیمتی پوشاک لا کر دی، اُن کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو عزت دی ہے وہ اسلام کی عزت ہے، ہمارے لئے یہی بس ہے، حضرت عمرؓ کے خیال میں مسلمان ہونا بیت المقدس کے غیر مسلموں کو متاثر کرنے کے لئے کافی تھا، ہندستان کے مسلمان سوچیں کہ کیا وہ ایسے مسلمان ہیں جو یہاں کے غیر مسلموں کو متاثر کر سکتے ہیں،

ع : تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو،

انسانیت کو سنوارنے کے لئے ایمان، تزکیۂ نفس، زہد، تقویٰ، عفت، دیانتداری، حیا، رحم، عدل، عہد کی پابندی، عفو، درگذر، حلم، تواضع، خوش کلامی، ایثار، اعتدال پسندی، خودداری، شجاعت، استقامت، حق گوئی اور استغنا وغیرہ جیسے اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے، ان سب کی تعلیمات ہمارے رسول اکرمؐ نے دیں، اور خود بھی ان پر عمل کر دکھایا، آپ کا ارشاد ہے کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کیلئے بھیجا گیا ہوں، آپ نے اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دی کہ سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں، قیامت کی ترازو میں حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی اور چیز نہ ہوگی، لوگوں کو قدرت الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئی ہیں ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں، ہندوستانی مسلمان اپنا محاسبہ کریں کہ وہ قدرت کے اس بہترین عطیہ کے حصہ دار کس حد تک ہیں، آج سے پون صدی پہلے مسلمانوں کے متعلق شاعر اسلام نے جو یہ کہا تھا،

یہ مسلماں ہیں، جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود

کیا یہ اب بھی ان پر اطلاق نہیں ہوتا ہے؟

مسلمان سوچیں کہ ان کی اجتماعی زندگی کی نشأۃ الثانیہ کا ذریعہ وہی اخلاق بن سکتا ہے جس کی تعلیم ان کے مذہب نے دی ہے یا کسی سیاسی مفکر کا نظریہ ان کو حیات نو دے سکتا ہے؟ یہ دور مذہب بیزاری کا ہے، اسکی فرسودگی، عدم رواداری، انسانوں کے درمیان افتراق انگیزی اور جنگ میں اسکی خون آشامی سے متعلق اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ

خلاف ذہن بری طرح مسموم ہو چکا ہے، مگر اسی دور میں ہیروشیما اور ویٹ نام میں انسانیت کے خون سے جو ہولی کھیلی گئی ہے، وہ مذہب کی تاریخ میں نہیں پڑھی جاسکتی ہے، فرنگی مدنیت کی میخواری، فحاشی، عریانی اور نظری و فکری عیاشی کے جب تمام تجربات ختم ہو چکے ہونگے تو پھر روحانی سکون کی تلاش ہوگی جو مذہب ہی کے ذریعہ سے ملیگا، مذہب کی بیزاری کا امام روس سمجھا جاتا ہے، مگر وہ بھی اب مذہبی اجتماعات کرانے کی فکر میں رہنے لگا ہے،

ہندوستان کی سیکولرزم کا خوش آیند پہلو یہ ہے کہ یہاں ہر مذہب کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا گیا ہے، جبلی طور پر ہندوستان کا مزاج بھی مذہبی واقع ہوا ہے، جدید نظر و فکر سے وقتی طور پر اس کا مذہبی شعور دب جاتا ہے، مگر پھر ابھر آتا ہے، ہندوستان کی سیاست میں گاندھی جی کی مہاتمائیت کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہا، گاندھی جی کی جنگ آزادی میں انکی مذہبیت کے نیچے تمام لیڈروں کی نظری اور فکری موشگافیاں دب کر رہ گئی تھیں، مولانا محمد علیؒ پر الزام تھا کہ ان پر مذہب کا جنون طاری رہا، مگر انھوں نے لندن کی گول میز کانفرنس میں اپنی مشہور تقریر میں یہ کہا تھا کہ ہم ہندوستان میں ریاست ہائے متحدہ کے بجائے مذاہب متحدہ کے مالک ہونگے، جو ایک دوسرے سے بالکل مشابہ تو نہیں لیکن انکی یکرنگی میں یکرنگی ہوگی، ہم اپنی آپ عزت کر کے دوسروں کی عزت کریں گے، انفرادی حیثیت سے مختلف ہونگے لیکن اس میں اس طرح ملے ہونگے، جس طرح محبت کرنیوالے ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں، یہ کوہ سینا کا کوئی نغمہ نہیں بلکہ رسول عربی کی آواز بازگشت ہے، آپ کا ارشاد ہے کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، اس کے نزدیک سب پسندیدہ لوگ ہیں جو اس کے کنبہ کے ساتھ نیکی کریں،

اگر ہندوستان کے مسلمان یہ ثابت کردکھائیں کہ رحمت للعالمین نے انسانی اخوت کا جو درس دیا ہے اس کے وہ عملی نمونے ہیں تو ان کے ہاتھ میں الہ دین کا چراغ آجائے گا، جس کے بعد دنیا ان کے پیچھے دوڑے گی، وہ دنیا کے پیچھے دوڑتے نظر نہ آئیں گے، ع تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری،

اگر مسلمانوں کا یہ طرز فکر ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے حلقہ پیام انسانیت کو ایک سیاسی پارٹی تو نہیں بلکہ ایک نئی اور مانوس صدا لگانے والوں کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنانے میں کامیاب نہ ہوں،

مقالات

اسلام مین مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۵)

میرے استاد حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبی جلد چہارم میں صحیح مسلم کتاب الایمان سے دو بہت ہی موثر اور سبق آموز واقعات کا ذکر کیا ہے، ایک تو یہ کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے آپ سے پوچھا کہ اگر لڑائی میں میرا حریف اپنی تلوار سے میرا ہاتھ اڑا دے اور جب میرے حملہ کی باری آئے تو درخت کی آڑ پکڑ کر کہے میں مسلمان ہوتا ہوں" تو میں کیا کروں، اس کو قتل کر دوں"، فرمایا نہیں، اس کا قتل جائز نہیں عرض کی یارسول اللہ میرا ہاتھ اس نے کاٹ ڈالا، پھر بھی اس کا قتل جائز نہیں، فرمایا اگر تم نے اب اس کو قتل کیا تو وہ وہ ہو گیا جو تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم وہ ہو جاؤگے جو وہ اس اقرار توحید سے پہلے تھا،

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ کے چہیتے خادم اسامہؓ بن زید ایک مہم پر بھیجے گئے تو جب گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی تو ایک شخص ان کی زد میں آگیا، انھوں نے حملہ کا قصد کیا تو وہ لاالہ الا اللہ پکار اٹھا، حضرت اسامہؓ سمجھے کہ اس نے جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھ لیا ہے، اس لیے نیزہ سے اس کا کام تمام کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر معلوم ہوئی تو اسامہ سے سخت آزردہ ہوئے، اسامہ نے عرض کی یارسول اللہ! اس نے صرف تلوار کے

ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، فرمایا اے اسامہ! تم نے کیا اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا، پھر برابر یہ فرماتے رہے، اے اسامہ! تم قیامت میں اس کے لا الٰہ الا اللہ کا کیا جواب دوگے،

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے استادی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے تحریر فرمایا ہے، کہ دیکھو واقعہ کی تصویر کتنی الٹ دی گئی ہے، واقعہ تو یہ تھا کہ اس حملہ آورانہ لڑائی کے گھمسان میں بعض کفار اور مشرکین جن کو یہ معلوم تھا کہ کسی کلمہ گو کو مسلمان اپنے مذہب کے حکم کے بموجب قتل نہیں کرتے تو جب وہ مسلمانوں کی زد میں پڑجاتے تھے، تو اپنی جان بچانے کے لیے فوراً کلمۂ شہادت پڑھ دیتے تھے، اور یہاں اس صورت میں کہا جاتا ہے کہ اسلام نے تلوار کی نوک سے کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا، کیا یہ صداقت ہے؟

ایک حدیث یہ ہے،

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ	مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے
حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ	اُس وقت تک لڑائی کروں جب
اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ	تک وہ لا الٰہ الا اللہ و محمد رسول اللہ نہ کہیں
اللّٰهِ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ	جب وہ اقرار کرلیں تو انھوں نے اپنے
عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَاءَهُمْ وَ	جان و مال کو مجھ سے بچالیا، انکی نیت
اَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ	کی پرسش خدا کا کام ہے،
وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ (بخاری)	

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے استادی المحترم لکھتے ہیں کہ اس کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان سے لڑنا تو جائز نہیں، لیکن کسی غیر مسلم قوم سے بھی لڑنا اسی وقت تک جائز ہے جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کرے، اور جب اس نے یہ کرلیا تو پھر اس سے بھی لڑنا جائز نہیں،

خواہ وہ حملہ کے ڈر سے لا الٰہ الا اللہ پڑھے یا سچے دل سے اس نے یہ اقرار کیا ہو، اس کی تحقیق کہ کس نیت سے اس نے کلمہ پڑھا، انسان کا فرض نہیں ہے، خدا کا ہے، یہ بالکل ایک مصالحانہ اعلان ہے لیکن لوگ اس کو اس معنے میں پیش کرتے ہیں کہ گویا اسلام کا حکم یہ تھا کہ مسلمان دیوانہ وار تلوار لیئے پھرتے اور جس کو پاتے اس کو ڈرا اور دھمکا کر کہتے کہ کلمہ پڑھو ورنہ سر قلم کر دیں گے، غور کرو، اگر یہ حکم ہوتا تو قیدی اقرار توحید کے بغیر آسانی سے چھوڑے جاتے؟ یا ہاری ہوئی قوموں سے اسلام قبول کرانے کے بجائے صرف چند درہم کا جزیہ لے کر ان کو آزاد کر دیا جاتا، اور کیا مسلمانوں کو یہ اجازت ملتی کہ اگر کفار کا محارب فریق صلح کیلئے جھکے تو تو بھی جھک جا، (انفال - ۸) بلکہ اس کے بجائے یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہوجائیں، ان سے صلح نہ کرنا، اور نیز کیا یہ مسلمانوں کو حکم ہوسکتا تھا کہ لڑائی کے میدان میں مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اسکو پناہ دے، یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اسکو اس کے امن کی جگہ پہونچا دے، (توبہ - ۱) بلکہ یہ ہوتا کہ پناہ ملنے اور کلام الٰہی سننے کے بعد وہ مسلمان نہ ہو تو اسکو اس کی امن کی جگہ پہنچانے کے بجائے اسکو قتل کر کے جہنم میں پہونچا دو، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو کس طرح الٹ پلٹ کر بیان کیا جاتا ہے، (سیرۃ النبی جلد چہارم، ص ۶۹ - ۳۶۶)

غزوات جارحانہ تھے یا مدافعانہ

ہجرت نبویؐ کے بعد مسلمانوں کے نیام سے ضرور تلواریں نکلیں مگر کب؟ مدینہ کے قیام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ۲ھ میں بدر اور سویق، ۳ھ میں احد، ۴ھ میں مریسیع، ۶ھ میں خیبر، ۸ھ میں موتہ، حنین اور اوطاس وغیرہ میں لڑائیاں لڑنی پڑیں، مگر یہ ساری لڑائیاں ان دشمنوں کے خلاف تھیں، جو حملہ آور ہوکر اسلام اور مسلمانوں کا استیصال چاہتے تھے،

آیندہ صفحات سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کے خلاف تلواریں اٹھیں تو اسلام کے نیام سے بھی تلواریں نکل پڑیں،

رسول اللہؐ اپنے جان نثاروں کے ساتھ مدینہ منورہ میں آکر ابھی اچھی طرح سکونت پذیر بھی نہیں ہوئے تھے کہ مکہ کے غیر مسلموں کا ایک خط مدینہ کے ایک بڑے سردار عبداللہ بن ابی کے نام پہونچا کہ تم نے ہمارے آدمیوں کو اپنے یہاں پناہ دی، ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ تم لوگ ان کو قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کریں گے، اور تم کو فنا کر کے تمھاری عورتوں پر تصرف کریں گے، (بخاری باب التسلیم من المسلمین والمشرکین سیرۃ النبی، جلد ۱ ص ۳۰۵) اس دھمکی کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کی نیند حرام ہوگئی، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو جاگتے، صحابہ صبح تک ہتھیار باندھ کر سوتے، سنہ ۲ ہجری میں اللہ تعالے کی طرف سے حکم ملا

قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ (بقرہ ۷-۲۴) — خدا کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں،

اس آیت سے ظاہر ہے کہ مسلمان خدا کی خاطر ان سے لڑیں جو ان سے لڑتے ہیں، یہ حکم نہیں ہے، کہ خدا کی راہ میں ہر کس و ناکس سے لڑیں رسول اللہؐ نے حفاظت خود اختیاری میں جہاں اور تدبیریں کیں، وہاں قبائل سے معاہدے بھی کیئے، تاکہ وہ مکہ کے حملہ آوروں سے مل کر آپ کے لیے خطرناک نہ بن جائیں، آپ نے جہینہ، بنو ضمرہ، بنو مدلج سے بڑے فراخدلانہ شرائط طے کیے، مثلاً جہینہ کے قبیلہ سے یہ معاہدہ ہوا کہ وہ بالکل غیر جانبدار رہیں گے، بنو ضمرہ سے یہ طے ہوا کہ ان لوگوں کے جان و مال محفوظ رہیں گے، اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا، اس کے مقابلہ میں ان کی مدد کی جائے گی،

بجز اس صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلہ میں لڑیں اور پیغمبر جب ان کو مدد کے لیے بلائیں گے تو یہ مدد کو آئیں گے، بنو مدلج سے بھی اسی قسم کے معاہدہ ہوا، (زرقانی جلد ۱ ص ۴۵۹ و سیرۃ النبی جلد ۱ ص ۳۱۰-۱۲)

احتیاطی تدبیر ہی کے سلسلہ میں آپ نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ نخلہ بھیجا جو مکہ اور طائف کے درمیان تھا، تاکہ وہ قریش کی جنگی کارروائیوں اور سرگرمیوں کی خبروں سے آپ کو وہاں سے مطلع کرتے رہیں، نخلہ کے قیام کے زمانہ میں مکہ کے چند معزز اشخاص شام سے منقے، چمڑے اور تجارتی مال لے کر آرہے تھے، حضرت عبداللہؓ نے ان پر حملہ کر دیا، اور ان کے ایک اہم آدمی عمرو بن الحضرمی کو قتل کر دیا، اور دو شخص کو گرفتار کر لیا، ان کو اور مال غنیمت کو لے کر حضرت عبداللہؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ کو بڑا دکھ ہوا، اور فرمایا، "میں نے تم کو ماہ حرام میں قتال کا حکم نہیں دیا تھا" مال غنیمت لینے سے انکار کر دیا، صحابہ بھی حضرت عبداللہؓ سے برہم ہوئے کہ تم وہ کر گذرے جس کا حکم تم کو نہ تھا، مکہ کے غیر مسلم رسول اللہؐ سے جنگ کرنے کے لیے بے تاب ہی تھے، یہ واقعہ ان کے لیے مزید بہانہ تھا، ابن حضرمی کے خون کا خون بہا ادا کرنے کی کوشش کی گئی، مگر ابو جہل نے حضرمی کے بھائی عامر کو اس پر رضامند ہونے نہیں دیا، غیر مسلم مدینہ کی طرف جارحانہ حملہ کے لیے بڑھے رسول اللہؐ مدینہ سے نکل کر بدر کے میدان میں ان سے صف آرا ہوئے، آپ کے ساتھ تین سو دس آدمی تھے، دشمنوں کی تعداد تین گنی زیادہ تھی، ان کے ساتھ ایک ہزار آدمی تھے جن میں سواروں کا رسالہ بھی تھا، قریش کے تمام سردار حملہ آوروں کے ساتھ تھے صرف ابو لہب کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آسکا تھا، رسول اللہؐ کے لیے کھجور کی ایک جھونپڑی بنادی گئی،

آپ اسی میں فروکش ہوئے (طبری جلد اول ص ۱۸۲، اردو ترجمہ) میدان جنگ میں پانی کی کمی تھی، بارش ہوئی، تو پانی جمع کر لیا گیا، مگر دشمنوں کو کافی پانی نہ مل سکا، رسول اللہؐ نے ان کو اپنی سمت سے پانی لینے کی اجازت دیدی، (ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۶) لڑائی شروع ہوئی تو آپ یہ دعا فرماتے رہے،

"خداوندا یہ قریش غرور اور نخوت کے ساتھ تجھ سے لڑنے اور تیرے رسول کو جھٹلانے آگئے ہیں، تونے جو مجھ سے نصرت کا وعدہ فرمایا ہے، اسے پورا کر اور آج ہی ان کا خاتمہ کر دے، (طبری جلد اول اردو ترجمہ ۱۰۳ عربی ۱۲۸۸)

خداوندا اگر یہ مسلمانوں کی جماعت ہلاک ہوگئی تو پھر آج کے بعد دنیا میں کوئی تیرا پرستار نہ رہے گا۔

اے بار الٰہ! تونے جو وعدہ مجھ سے کیا ہے اسے پورا کر، اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو تیری عبادت موقوف ہو جائے گی، (طبری جلد اوّل اردو ترجمہ ص ۱۸۹، عربی ص ۱۳۱۹)

آپ اسی طرح کی دعاؤں میں برابر مصروف رہے، کچھ اس الحاح وزاری میں اب کی چادر آپ کے اوپر سے گر پڑی تو حضرت ابوبکرؓ نے اٹھا کر پھر آپ کے اوپر رکھدی، اور بالکل قریب آکر عرض کیا یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر نثار آپ نے دعا کا حق ادا کر دیا، اب آپ زیادہ نہ کہیں، بہت جلد اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا کرے گا، (طبری جلد اول اردو ترجمہ ص ۱۸۹، عربی ص ۲۰-۱۳۱۹)

ان دعاؤں کی نوعیت بتا رہی ہے کہ رسول اللہؐ محض مدافعانہ جنگ لڑنے کے لیے آمادہ ہوئے تھے، یعنی اسلام کی طرف سے نہیں بلکہ اسلام کے خلاف تلوار اٹھی تھی، لڑائی میں

اسلام کی فتح ہوئی، آپ نے اس کی بشارت دینے کے لیے عبداللہ بن رواحہؓ کو اہل العالیہ اور زید بن حارثہؓ کو اہل السافلہ کے پاس روانہ کیا، اسامہ بن زیدؓ کا بیان ہے کہ ہم کو اس فتح کی خبر اس وقت ملی جب ہم رقیہ بنت رسول اللہ صلعم کو دفن کر رہے تھے، جو حضرت عثمانؓ بن عفان کے نکاح میں تھیں، (طبری جلد اول اردو ترجمہ ص ۱۹۹ عربی ص ۱۳۴۴) اس لڑائی میں جو لوگ قیدی ہوئے، ان میں رسول اللہؐ کے داماد ابو العاص بن الربیع بھی تھے، جن کے نکاح میں حضرت زینبؓ بھی تھیں، یہ حضرت خدیجہؓ کی خالہ کے بیٹے تھے، ان قیدیوں کے ساتھ رسول اللہؐ نے جو سلوک کیا وہ دنیا کے لیے ایک مثال ہے، اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، جب اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کی رہائی چاہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاجزادی حضرت زینبؓ نے بھی اپنے شوہر کے فدیہ کے لیے کچھ مال بھیجا، اس میں وہ ہار بھی تھا جو حضرت خدیجہؓ نے ان کو جہیز میں دیا تھا اس ہار کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے چین ہوگئے، آپ نے صحابہ سے فرمایا اگر مناسب سمجھو تو زینب کی خاطر اس کے اسیر شوہر کو رہا کر دو اور اس کے ہار کو بھی اس کو واپس دیدو، صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ ہم خوشی سے اس کے لیے تیار ہیں، ابو العاص کو چھوڑ دیا گیا، اور حضرت زینبؓ کا ہار ان کو واپس دیدیا گیا،

ابو العاص نے مکہ پہونچ کر حضرت زینبؓ کو رسول اللہؐ کے پاس جانے کی اجازت دیدی، وہ ابو العاص کو مکہ میں چھوڑ کر مدینہ رسول اللہ کے پاس چلی آئیں، اسلام نے دونوں کے درمیان تفریق کر دی تھی، فتح مکہ سے کچھ عرصہ پہلے ابو العاص تجارت کے لیے شام گئے، ان کی دیانت مشہور تھی، اس لیے قریش کے اور لوگوں نے تجارت کے لیے اپنا مال ان کے ساتھ کر دیا تھا، جب وہ واپس آرہے تھے تو مدینہ کی ایک فوج نے ان کو

دشمن سمجھ کر ان کے مال پر قبضہ کر لیا، وہ کسی طرح چھپ کر رات کو مدینہ پہونچ گئے، اور حضرت زینبؓ سے پناہ مانگی، انھوں نے ان کو پناہ دیدی، اور ان کا مال واپس کرانے کا وعدہ کیا، فجر کی نماز میں حضرت زینبؓ نے عورتوں کی صف سے چلا کر کہا اے صاحبو! میں نے ابو العاص کو پناہ دیدی ہے، نماز کا سلام پھیر کر رسول اللہؐ نے صحابہ کو مخاطب کر کے کہا صاحبو! تم نے سنا جو میں نے سنا، انھوں نے کہا جی ہاں آپؐ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، اس سے پہلے مجھے اس واقعہ کا علم نہ تھا، جب ایک ادنیٰ فرد نے تمام مسلمانوں کی طرف سے پناہ دیدی ہے تو اس کو پناہ ملنی چاہیے، اس کے بعد آپ اپنی صاحبزادی کے پاس آئے اور فرمایا، اے میری بچی، تم ابو العاص کی اچھی طرح مہمانداری کرو، مگر اپنے پاس نہ آنے دینا کیونکہ اب تم اس کے لیے حلال نہیں ہو، اسکے بعد ابو العاص کا تمام مال ان کو واپس کر دیا گیا، جب وہ مکہ آئے تو ایک ایک چیز ان لوگوں کے حوالہ کر دی جن سے وہ لے کر تجارت کرنے گئے تھے، اس کے بعد انھوں نے پوچھا اے جماعت قریش! تم میں سے اب کوئی ایسا شخص رہ گیا ہے، جس کا مال میرے پاس ہو، اور وہ اس کو اب تک وصول نہ ہوا ہو، انھوں نے کہا نہیں، کوئی اب ایسا نہیں ہے، سب کو ان کا مال پہونچ گیا ہے، ہم نے تم کو نہایت معتبر اور شریف پایا، اس کے بعد ابو العاص نے اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ پڑھا پھر اہل قریش کو مخاطب کر کے بولے میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا، اسی وقت ایمان لے آتا، مگر میں ڈرا کہ تم لوگ یہ بدگمانی کروگے کہ اس طرح سے میں نے تمھارے مال کھانے کی ترکیب کی ہے، جب اللہ نے اسے تم کو پہونچا دیا، اور بار امانت سے فارغ ہوا تو اسلام لے آیا، اس کے بعد وہ مکہ سے مدینہ آگئے، ان کے آنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

نے حضرت زینبؓ کو ان کے نکاح میں دے دیا، (طبری اردو ترجمہ ج ۱ ص ۲۱۲-۲۰۷، عربی ص ۱۳۵۱-۱۳۴۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے اور دوسرے اسیروں کو فدیہ لے کر رہا کر دیا، اور ان کو مکہ واپس ہو جانے کی اجازت مل گئی، ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جاسکتی تھی، اور اگر وہ قبول نہ کرتے تو ان کو قتل کر دیا جا سکتا تھا، مگر ایسا نہیں کیا گیا۔

بدر کی لڑائی میں شکست کھانے کے بعد غیر مسلموں میں انتقامی جذبات اور بھی ابھر گئے، ان کے سردار ابو سفیان نے عہد کیا کہ جب تک وہ اس کا انتقام نہ لے گا، سر میں تیل نہ ڈالیگا اس نے اپنے ہم مذہبوں کو برانگیختہ کرنے کے لیے عربی میں کچھ اشعار کہے تھے جن کا مطلب یہ ہے کہ یثرب اور مسلمانوں کی جماعت پر پیش قدمی کرو، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ انھوں نے جمع کیا ہے، وہ تم کو مل جائے گا۔ اگر بدر میں انکو کامیابی ہوئی تو اب آیندہ تم کو کامیابی ہوگی، میں نے قسم کھائی ہے کہ نہ میں عورتوں کے پاس جاؤنگا، اور نہ اب نہاؤنگا جب تک کہ تم قبائل اوس اور خزرج کو فنا نہ کر دوگے، میرا دل آتشِ انتقام سے شعلہ زن ہے (تاریخ طبری اول حصہ سوم، اردو ترجمہ ص ۲۲۵ - ۲۲۴، عربی ص ۱۳۶۶) ابو سفیان دو سو سواروں کو لے کر مدینہ پر حملہ آور ہوا، یہودی قبیلہ بنو نضیر کے ...... سردار سلام بن مشکم کو اپنا حلیف بنایا، اور مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر عریض میں آکر محاذ آرائی کی، ایک انصاری سعد بن عمرو کو قتل کیا، چند مکانات اور گھاس کے انبار جلا دیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی، تو آپ اس کے تعاقب میں نکلے، ابو سفیان بھاگ نکلا اور گھبراہٹ میں ستو کے بورے پھینکتا گیا، عربی میں ستو کو سویق کہتے ہیں، اسی لیے یہ لڑائی غزوۂ سویق کہلائی، (تاریخ طبری ج اول حصہ سوم اردو ترجمہ ص ۲۲۵ عربی ص ۱۳۶۰)

یہ غزوہ جارحانہ کے بجائے بالکل مدافعانہ تھا،

غیر مسلموں کا انتقامی جذبہ اور بھی بڑھا، ۳ھ میں وہ مدینہ پر پھر حملہ آور ہوئے، انکی فوج کی تعداد تین ہزار تھی، جن میں دو سو سوار تھے اس کے مقابلہ میں رسول اللہ صلعم کے ساتھ صرف سات سو مسلمان تھے، یہ غیر مسلم اپنے ساتھ عورتیں بھی لائے تھے، جو خود جوش انتقام سے لبریز تھیں، انھوں نے منتیں مانی تھیں کہ اولاد کے قاتلوں کا خون پی کر دم لیں گی، پہلے تو مہاجر صحابیوں کی یہ رائے ہوئی کہ عورتیں باہر قلعوں میں بھیجدی جائیں اور شہر میں پناہ گیر ہو کر مقابلہ کیا جائے، لیکن نوخیز بہادر صحابیوں کا خیال ہوا کہ شہر سے نکل کر دشمنوں کا مقابلہ کیا جائے، احد میں طرفین کا اجتماع ہوا، غیر مسلمون کی فوجی کاروائی کا پلہ بھاری رہا، ان کی عورتیں دف پر گا گا کر ان کی ہمت بڑھاتی رہیں، وہ ان کو اشعار پڑھ پڑھ کر للکارتیں کہ ہم خاندانی بی بیاں ہیں، آگے بڑھو گے تو گلے ملیں گے، اور فرش بچھائیں گے، اگر منہ موڑو گے تو کسی خیال کے بغیر قطع تعلق کر لیں گے، اے بنی عبدالدار اے پشت بچانے والو شمشیر بران سے مارو، یہاں پر یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو دجانہؓ کو لڑنے کے لئے ایک تلوار دی تھی وہ لڑائی میں ایک غیر مسلم عورت کے پاس پہونچے جو اسی قسم کے اشعار پڑھ کر غیر مسلمون کو غیرت دلا رہی تھی، ابو دجانہؓ نے اسکو مارنے کے لیے تلوار اٹھائی، مگر پھر رک گئے، جب ان سے پوچھا گیا کہ انھوں نے عورت پر تلوار اٹھا کر اپنی کارگذاری کیوں نہیں دکھائی تو بولے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کو اس سے برتر سمجھا کہ اس سے عورت کو قتل کروں، (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم اردو ترجمہ ص ۲۴۵، عربی ص ۱۳۹۰)

مگر دوسری طرف سے یہ نمونہ پیش ہوا کہ لڑائی کے بعد غیر مسلم عورتوں نے مسلمان شہدا کے

کان ناک کاٹ لیے، ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے ان کا ہار بنا کر پہنا، اور حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبا گئی، آخر یہ غیر مسلم بھی کسی مذہب کے پابند تھے، یہ سفاکانہ سلوک ان کے مذہب کی کس تعلیم پر محمول کیا جائے؟ ......، یہ جنگ احد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے محض مدافعت میں لڑی گئی،

۲ھ ہجری میں غزوۂ بنی قینقاع پیش آیا، یہ یہودیوں کا ایک بہادر قبیلہ تھا، بدر کی فتح کے بعد ان کو خیال ہوا کہ مسلمان طاقتور بنتے جا رہے ہیں، ان کو اپنے اقتدار کا خطرہ نظر آیا، پہلے ذکر آچکا ہے کہ مدینہ میں تشریف لانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیون سے معاہدہ کر کے باہمی صلح وآشتی کر لی تھی، مگر جنگ بدر کے بعد انھوں نے اس معاہدہ کو توڑ ڈالا، اور بدر اور احد کے درمیانی زمانہ میں مسلمانوں سے لڑائی کی، وہ مکہ کے غیر مسلمون کو خفیہ امداد بھی پہونچا کر ان کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے لگے، مدینہ میں ایک اتفاقی سبب یہ بھی پیش آیا کہ مدینہ کے بازار میں ایک یہودی دکاندار نے ایک انصاری عورت کی بے حرمتی کی، ایک مسلمان نے اس یہودی کو مار ڈالا، یہودیوں نے پھر اس مسلمان کو ہلاک کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نقض امن کا حال معلوم ہوا تو آپ یہودیون کے پاس تشریف لے گئے، اور ان کے بازار میں ان کو جمع کر کے کہا اے یہودیو! اللہ عزوجل سے ڈرو کہیں وہ تم کو ایسی سزا نہ دے جیسی کہ اس نے قریش کو دی ہے، تم اسلام لے آؤ، تم جانتے ہو کہ میں مرسل ہوں، جس کا ذکر خود تمھاری کتابوں میں ہے، اور اس میثاق میں ہے، جو اللہ نے تم سے لیا تھا، یہ سنکر یہودیوں نے یہ جواب دیا، اے محمد! تم ہم کو بھی اپنی قوم ایسا سمجھتے ہو، تم ایسے لوگوں سے

لڑے جو لڑائی سے بالکل واقف نہ تھے، تم نے ان کو زیر کر لیا تو اپنی کامیابی سے دھوکہ میں نہ پڑو، بخدا اگر تم ہم سے لڑے تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم مرد اہل نبرد ہیں، اسی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً — اگر تم کو کسی قوم کی خیانت کا اندیشہ
فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ (انفال) — ہو تو تم بھی ان کے ساتھ وہی کرو،

یہودیوں کی طرف سے نقض امن اور جنگ کا اعلان ہوا تو رسول اللہؐ نے ان کی تنبیہ کے لیے اقدام کئے، یہودی قلعہ بند ہو گئے، پندرہ دن تک محصور رہنے کے بعد سپر ڈال دی، یہ گویا یہودیوں کے خلاف محض پولیس ایکشن تھا، جب پورا قبیلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر گر پڑا تو اس زمانہ کا مشہور منافق عبداللہ بن ابی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور بولا "اے محمد! آپ ان موالیوں پر احسان کریں، یہ لوگ خزرج کے حلیف تھے" آپ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، تو عبداللہ بن ابی پھر بولا "اے محمد! آپ میرے موالیوں پر احسان کریں" یہ سن کر آپ نے منہ پھیر لیا، تو عبداللہ بن ابی نے بڑھ کر آپ کا گریبان پکڑ لیا، اس حرکت پر آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا، مگر عبداللہ بن ابی پھر بولا "بخدا، میں ہرگز اس وقت تک آپ کو نہیں چھوڑونگا، جب تک کہ آپ میرے موالیوں پر احسان نہ کریں گے، ان میں چار سو غیر مسلح اور تین سو زرہ پوش ہیں، انھوں نے مجھے ہمیشہ حبشیوں اور ایرانیوں سے بچایا ہے، آپ ان کو ایک وقت میں ختم کر دینا چاہتے ہیں، یہ سن کر آپ نے فرمایا اچھا میں نے ان کو تمھاری خاطر چھوڑا، مگر آپ نے ان کو جلا وطن کر دیا، جب وہ مدینہ سے باہر نکلے اور ذباب پہونچے تو کہتے جاتے کہ انسانی شرافت ابھی اور دور ہے، اور دور ہے، (تاریخ طبری جلد اوّل

حصہ سوم اردو ترجمہ ص ۲۲۱۔۲۲۰، عربی ص ۱۳۶۱۔۱۳۶۰)

یہودیوں کے ایک دوسرے قبیلہ بنو نضیر نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش کی، ان کو مکہ کے غیر مسلموں کی طرف سے یہ پیام ملا تھا کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دیں ورنہ ان کا استیصال کر دیا جائے گا، وہ اسلام کے دشمن پہلے ہی سے تھے، اس دھمکی نے ان کو رسول اللہؐ کی شہادت کے لیے آمادہ کر دیا، عبداللہ بن ابی نے بھی انکی سازش میں ان کا ساتھ دیا، رسول اللہؐ کو اس کی سازش کی خبر ہوئی تو ان کے خلاف بھی پولس ایکشن کیا، وہ بھی قلعہ بند ہو گئے، مگر انھوں نے سپر ڈال کر صلح کر لی، اور شام کی طرف چلے جانے کی اجازت مانگی، ان کو اجازت دی گئی کہ اسلحہ کے علاوہ جتنا بار اونٹ پر لاد سکیں وہ لے جائیں، جس شان سے وہ گاتے بجاتے یہاں سے نکلے ہیں اسکا ذکر پہلے بھی آچکا ہے، (نیز دیکھو تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم اردو ترجمہ ص ۲۹۰۔۲۸۹ عربی ۱۴۵۱۔۱۴۴۸)

۵ھ میں غزوہ بنی المصطلق پیش آیا، یہ قبیلہ مریسیع میں رہتا تھا جو مدینہ منورہ سے ۹ منزل پر ہے، اس کے سردار حارث بن ضرار نے مکہ کے غیر مسلموں کے اشارہ پر مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کی، یہ خبر پاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حفاظتی تدابیر کی خاطر ان کے خلاف صف آرائی کی جو معمولی لڑائی کے بعد پسپا ہوئے اس لڑائی میں عبداللہ بن ابی نے جو منافقانہ رویہ اختیار کیا، اور اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو رواداری دکھائی، وہ بھی اپنی مثال آپ ہے، وہ بظاہر مسلمان ہو گیا تھا، مگر اندرونی طور پر اسلام کے دشمنوں سے ملا رہا، اس غزوہ کی فتح کے بعد اس نے اپنی قوم کو مسلمانوں کے خلاف یہ کہہ کر ابھارا، بخدا ہمارے دشمنوں اور قریش کے

غلاموں کی وہی مثل ہے کہ اگر درندے کو تم پرورش کروگے تو وہ تم ہی کو کھا جائے گا، مدینہ جاتے ہی وہاں کا جو سب سے معزز شخص ہے، وہ اس کو جو سب سے ذلیل ہے، نکال دے، تم نے ان کو اپنے وطن میں اتارا، اپنی املاک میں شریک کیا، اگر تم ایسا نہ کرتے تو وہ کسی اور جگہ جاتے، عبداللہ بن ابی کی اس منافقت کی خبر زید بن ارقمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی، اس وقت حضرت عمر فاروقؓ بھی وہاں موجود تھے، وہ بول اٹھے کہ آپ عباد بن بشر بن وقش کو حکم دیں کہ وہ عبداللہ بن ابی کو جا کر ہلاک کر دیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عمر! یہ تو دیکھو کہ جب لوگوں میں اس بات کا چرچا ہوگا کہ محمد خود اپنے ساتھیوں کو قتل کرا دیتے ہیں، تو اس کا کیا اثر پڑے گا، عبداللہ ابن ابی کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچ گئی ہے، تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے حلف اٹھا کر ان باتوں سے انکار کیا، وہ اپنی قوم میں بہت ہی معزز سمجھا جاتا تھا اسلیے صحابہ نے اوس کو الزام سے بچانے کے لیے آپ سے عرض کیا کہ شاید زید بن ارقم کے سننے میں غلطی ہوئی ہو جب آپ مدینہ کی طرف تشریف لیجا رہے تھے، تو راستہ میں اسید بن حضیرؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے فرمایا کہ تم کو اپنے آدمی کی یہ بات نہیں معلوم ہوئی کہ وہ کہتا ہے، مدینہ جا کر جو سب سے معزز ہے، وہ سب سے ذلیل کو نکال دے گا، اسیدؓ نے کہا آپ چاہئیں تو اسے فوراً نکال دیں، بخدا آپ ذی عزت ہیں، اور وہ نہایت ذلیل ہے، مگر انھوں نے کہا یا رسول اللہ! مناسب ہے کہ اس وقت آپ اس سے درگذر کریں، اس کی قوم اس کے لیے گھونگوں کا تاج بنا رہی ہے، مگر وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا، کہ اس کی حکومت کس طرح آپ کو حاصل ہوتی ہے، عبداللہ بن ابی کے لڑکے عبداللہؓ رسول اللہ کے جان نثاروں میں تھے، انکو اپنے باپ

کی ان باتوں کا علم ہوا، تو وہ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میں نے سنا ہے کہ اس شکایت کی بنیاد پر جو آپ کو میرے باپ سے پہونچی ہے، آپ ان کو قتل کر دینا چاہتے ہیں، اگر ایسا ہے تو آپ خود مجھے اس کا حکم دیں، خزرج کا تمام قبیلہ یہ جانتا ہے کہ میں اپنے باپ کا بہت ہی مطیع ہوں، اگر میرے علاوہ کسی اور کو آپ میرے باپ کے قتل کرنے کا حکم دیں گے تو یہ مناسب نہ ہوگا، کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو چلتا پھرتا دیکھوں پھر اس طرح ایک مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل کر کے ہمیشہ کے لیے دوزخ میں اپنا ٹھکانا بناؤں گا، یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم قتل کرنا نہیں چاہتے، جب تک وہ ہمارے ساتھ ہیں ہم ان کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا چاہتے ہیں، اس واقعہ کے بعد جب عبداللہ بن ابی اپنے قبیلہ والوں سے کوئی بات کہتا تو اس کی قوم اس کو برا کہتی اور سزا کی دھمکی دیتی، جب آپ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا، اگر میں تمھارے مشورے کے مطابق اس کو قتل کر دیتا تو ضرور اس کی قوم کی رگ حمیت اور حمایت جوش اور حرکت میں آتی، اور اگر آج میں اس کے قتل کا حکم دوں تو خود اس کی قوم بھی اس کا کام تمام کر دے حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے محسوس ہوا کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کارروائی میرے مشورے سے زیادہ موجب برکت تھی۔ بنی المصطلق کی لڑائی میں بہت سی عورتیں بھی گرفتار ہوئیں، جو مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئیں، ان میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جویریہؓ سے خود نکاح کر لیا، اس کے بعد صحابہ نے کہا کہ بنی المصطلق تو اب رسول اللہؐ کے سسرالی رشتہ دار ہو گئے، اس لئے جو لونڈی اور غلام جس کے پاس ہو وہ اس کو آزاد کر دے، چنانچہ محض اس شادی کی وجہ سے سو سے زیادہ آدمی آزاد کر دیے گئے،

یہ بھی رواداری کی ایک عمدہ مثال ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے جویریہؓ سے بڑھ کر اپنی قوم کے لیے بابرکت بی بی کوئی اور نہیں دیکھی، (تاریخ طبری ج اول حصہ سوم اردو ترجمہ ص ۳۴۲-۳۴۸، عربی ص ۱۵۱۴-۱۵۱۱)

اسی سال یہودیوں سے جنگ احزاب (خندق) ہوئی، یہ بھی دفاعی لڑائی تھی، بنی نضیر جلاوطن ہوئے تو انھوں نے مکہ کے قریش کو یہ لالچ دے کر ابھارا کہ خیبر کی نصف آمدنی ان کو ہمیشہ دیدی جائے گی، قریش کے قبیلوں میں بنی غطفان، بنو اسد اور بنو سلیم نے یہودیوں سے سازش کر کے چوبیس ہزار لشکریوں کے ساتھ مدینہ پر اس یقین کے ساتھ حملہ کیا کہ وہ اسلام کا خاتمہ ہمیشہ کے لیے کر دیں گے، مسلمانوں پر اس لشکر جرار کا ہراس طاری ہو گیا، رسول اللہؐ مدینہ سے باہر نکل آئے اور خندق کھود کر مدافعانہ جنگ کی تیاری کی، اب کی معیت میں تین ہزار صحابی تھے، مہاجرین اور انصار کے ساتھ مل کر آپ نے بھی خندق کھودی، جس کا عمق پانچ گز رکھا گیا، غیر مسلموں نے مدینہ کا محاصرہ ہر طرف سے کر لیا تو آپ نے کوہ سلع کو اپنے عقب میں رکھ کر وہاں پڑاؤ کیا، اور خندق کو اپنے اور دشمن کے مابین رکھا، بچوں اور عورتوں کو قلعوں میں بھیج دیا، یہودیوں کا قبیلہ بنی قریظہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امن کا معاہدہ کر رکھا تھا، مگر وہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسلام کے دشمنوں سے آملے، اور عہد و پیمان کا خیال کئے بغیر آپ کی شان میں گستاخی کے الفاظ استعمال کرنے لگے،

یہ محاصرہ ایک مہینہ تک رہا، صحابہ کرام فاقہ کرنے لگے، ایک دن انھوں نے بے تاب ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شکم کھول کر دکھائے کہ پتھر بندھے ہیں،

لیکن آپ نے اپنا شکم مبارک کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر تھے، محاصرہ سے گھبرا کر صحابہ کے دلوں میں ہر قسم کے برے خیالات آنے لگے، بعض منافقین بھی ساتھ تھے، اس موقع پر انکا نفاق ظاہر ہو گیا، وہ کہتے کہ محمدؐ ہم سے وعدہ کرتے تھے کہ ہم کسریٰ اور قیصر کے خزانوں کو اپنے تصرف میں لائیں گے، اس کے برخلاف اب یہ نوبت آگئی ہے کہ ہم اپنی ضروریات سے فارغ ہونے کو بھی باہر نہیں جا سکتے، محاصرین خندق کو تو عبور نہیں کر سکتے تھے، دور سے تیر اور پتھر برساتے تھے، محاصرہ کی سختی دیکھ کر آپ نے بنی غطفان سے مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث دے کر صلح کا معاہدہ کرنا چاہا، مگر صحابہ کرام کی غیرت و حمیت کچھ ایسی ابھری کہ آپ کو ان کے استقلال پر اطمینان ہوا، اس موقع پر حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ نے دشمنوں کے سرداروں سے لڑنے میں جو پامردی اور بہادری دکھائی اس سے صحابہ کرام کے حوصلے بڑھے، یہودیوں نے اس قلعہ پر بھی حملہ کرنے کی کوشش کی جہاں مستورات تھیں، مگر رسول اللہؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ کی بہادری سے ان کو کامیابی نہیں ہوئی، محاصرہ طویل ہوا تو محاصرین ہمت ہارنے لگے، چوبیس ہزار آدمیوں کے لیے رسد پہونچانا بھی ان کے لیے مشکل ہو گیا، پھر ایک روز ایسی آندھی آئی کہ ان کے لشکر گاہ میں بڑی تباہی آگئی، یہودیوں اور قریش میں پھوٹ بھی پڑ گئی، اور وہ مکہ کی طرف بے نیل مرام پلٹ گئے، اس غزوہ میں رسول اللہؐ کی چار نمازیں قضا ہوئیں، تیراندازی اور سنگ باری کی وجہ سے آپ اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتے تھے، (تاریخ طبری ج اول حصہ سوم اردو ترجمہ ص ۳۱۹-۳۰۰، عربی ۱۴۸۵-۱۴۶۳) یہ جنگ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف مسلمانوں کی مدافعت میں لڑی، جیسا کہ آپ کی اس دعا سے بھی ظاہر ہے، جو آپ نے اس محاصرے کے موقع پر اللہ تعالے سے کی تھی، آپ مٹی اٹھاتے جاتے تھے، جس سے شکم مبارک غبار آلود

ہو جاتا، اور فرماتے جاتے۔

اے خدا تری مدد نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہ پاتے، اور نہ صدقہ دیتے اور نہ نماز پڑھتے، ہم پر سکون اور امن نازل فرما، اور دشمن کے مقابلہ کے وقت ہم کو ثابت قدم رکھ، یقیناً ان کافروں نے ہم پر ظلم کیا ہے جب یہ کسی برائی کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم اس کو دفع کرتے ہیں، (بخاری شریف باب الجہاد)

۶ ہجری میں صلح حدیبیہ ہوئی، جو رسول اللہؐ کی رواداری، بردباری اور فراخدلی کی اعلیٰ مثال ہے، مسلمانوں کی قوت اور تعداد بڑھی تو آپ نے خانہ کعبہ میں جا کر عمرہ ادا کرنے کا ارادہ کیا، آپ کے ہمرکاب چودہ سو صحابہ ہوئے، آپؐ نے صحابہ کے ساتھ احرام باندھا تاکہ مکہ کے غیر مسلموں کو حملہ کا شبہہ نہ ہو، مگر ان غیر مسلموں نے اپنے تمام قبیلوں کو جمع کر کے ایک جمعیت عظیم سے آپؐ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا، رسول اللہؐ نے مدینہ سے نکل کر راستہ طے کرتے ہوئے مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر ایک کنوئیں کے پاس قیام پذیر ہوئے، جس کا نام حدیبیہ ہے، یہاں پہونچ کر مکہ کے غیر مسلموں کو پیام دیا کہ ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے ہیں، بلکہ عمرہ کرنے آئے ہیں، لڑائی سے پہلے ہی قریش کا کس بل نکل گیا ہے، اگر وہ پسند کریں تو ہم ایک مدت کے لیے آپس میں سمجھوتہ کر لیں، اور باہمی مزاحمت سے باز آجائیں، تاکہ ہم اوروں سے نپٹ لیں، اگر ہم کو کامیابی ہو تو پھر ان کا جی چاہے تو اوروں کی طرح وہ بھی ہمارے ساتھ ہو جائیں، اور اگر ہو جائیں تو اس اثناء میں ان کو پنپنے کا موقع مل جائے گا، ان کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا، اور اگر وہ ان باتوں کو نہ مانیں تو قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں جس مقصد کے لیے آیا ہوں،

اس کے لیے آخر دم تک لڑوں گا، یہ پیام مکہ کے غیر مسلموں کے پاس پہونچا، تو پہلے انھوں نے اس کو سننا بھی گوارا نہیں کیا، لیکن ان ہی میں سے ایک معمر اور تجربہ کار شخص عروہ بن مسعود ثقفی کو یہ باتیں قابل قبول معلوم ہوئیں اسلیئے وہ ان پر گفتگو کرنے کیلئے رسول اللہؐ کے پاس پہنچا، اس نے آپ کی ذات مبارک سے صحابہ کی جو عقیدت اور محبت دیکھی اس سے متاثر ہوا مگر مکہ کے لوگوں کی رعونت اور غرور کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ سے گفتگو کی کہ تم پہلے اپنی ہی قوم کا استیصال کرنا چاہتے ہو، کیا تم سے پہلے کسی عرب نے ایسا کیا ہے کہ اپنی جڑ کاٹی ہو، اور دوسری شکل جو تم نے پیش کی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے درمیان مزاحم نہ ہوں تو مجھے جو مختلف صورتیں تمھارے ساتھ نظر آرہی ہیں، ان میں ایسے ہی لوگ ہیں جن کی فطرت یہ ہے کہ وہ بھاگ جائیں گے، اور تم کو دشمن کے نرغے میں چھوڑ دیں گے، اس گفتگو کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ بھی تھے، ان کو یہ گفتگو بہت ہی ناگوار ہوئی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑی رواداری سے عروہ کی باتیں سنتے رہے، وہ عرب کے قاعدہ کے مطابق بے تکلفانہ طریقہ سے باتیں کرتے ہوئے آپؐ کی ریش مبارک بار بار پکڑ لیتا، آپ کی حفاظت کے لیے مغیرہؓ بن شعبہ کھڑے تھے، ان کو یہ ناگوار ہوتا، مگر رسول اللہؐ خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے، عروہ نے اس ملاقات کے دوران دیکھا کہ آپؐ اپنے صحابی کو جب کوئی حکم دیتے ہیں تو وہ فوراً اس کی تعمیل کرتے ہیں، جب وضو کرتے ہیں تو وہ اس کے پانی کو لینے کے لیے آپس میں لڑنے لگتے ہیں، جب وہ آپ کے پاس آکر باتیں کرتے ہیں تو نہایت آہستہ آہستہ بولتے ہیں، اور تعظیماً آپؐ کو گھور کر نہیں دیکھتے ہیں، عروہ جب مکہ واپس گیا تو اس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ میں بادشاہوں کے دربار میں سفارت کے لیے گیا ہوں، میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے یہاں بھی گیا ہوں،

بخدا میں نے اپنوں میں کسی بادشاہ کی وہ عزت نہیں دیکھی جو محمدؐ کے ساتھی محمدؐ کی کرتے ہیں، پھر اس نے کہا کہ انھوں نے بہت معقول شرطیں پیش کی ہیں، وہ مان لی جائیں، اس کے بعد بنی کنانہ کا ایک اور معزز شخص رسول اللہؐ کی خدمت میں بھیجا گیا، اسکے استقبال کے لیے آپؐ نے قربانی کے جانور بھی بھیجے، جس سے متاثر ہو کر اس نے کہا کہ یہ لوگ ہرگز ایسے نہیں ہیں کہ ان کو بیت اللہ کی زیارت سے روکا جائے، اس کے بعد مکہ کے لوگوں نے حلیس بن علقمہ کو آپؐ کے پاس بھیجا، جو اس وقت حبوش کا سردار تھا، آپؐ نے اس کو آتا ہوا دیکھ کر فرمایا، یہ دیندار دوں کے خاندان کا آدمی ہے، اس کے سامنے نذر کے اونٹ پیش کئے جائیں، جب اس نے ان جانوروں کو دیکھا تو اس قدر متاثر ہوا کہ وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کے بجائے مکہ پلٹ گیا، جہاں پہونچ کر اس نے کہا اے قریش! میں نے خود نذر کے وہ جانور دیکھے ہیں جن کے گلوں میں قلادے پڑے تھے، اور معلوم ہوتا تھا، کہ وہ بہت دنوں سے پڑے ہوئے تھے، کیونکہ قلادے کی جگہ کے بال جھڑ گئے تھے، ان کو ان کے مقام تک پہونچنے سے روک دینا مناسب نہیں، اسکے بعد اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ ہم نے تم سے دوستی اور مدد کا معاہدہ اس لیے نہیں کیا ہے کہ ان لوگوں کو جو بیت اللہ کی عظمت کا اظہار کرنے آئیں، ان کو یہاں نہ آنے دیا جائے، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یا تو تم محمدؐ کو کعبہ آکر عمرہ ادا کرنے دو، ورنہ میں اپنے تمام ساتھیوں کو لے کر حبوش چلا جاؤں گا، اور تمھارا ساتھ چھوڑ دونگا، اس کے بعد مکہ کے لوگوں کی طرف سے مکرز بن حفص آپؐ کی خدمت میں پہونچا، آپؐ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ یہ بدکردار اور بدکار آدمی ہے، پھر بھی آپؐ نے اس سے باتیں شروع کیں، اسی اثنا میں سہیل بن عمرو آپؐ کے پاس پہونچ گئے،

اس کو آتے دیکھ کر آپؐ نے صحابہ سے فرمایا، اب تمھارا کام آسان ہو گیا ہے اب یہ اپنے خاندانی تعلقات کی وجہ سے تم سے صلح کی درخواست کریں گے، تم قربانی کے جانور انکو دکھاؤ اور لبیک لبیک کے نعرے بلند کرو، شاید اس سے ان کے دل نرم پڑ جائیں، اور ابھی صلح کی بات شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ ابوسفیان نے اچانک ایک حملہ کر دیا، پوری وادی آدمیوں اور اسلحہ سے پر ہو گئی، چھ[6] مسلح حملہ آور گرفتار ہوئے تو آپؐ کی خدمت میں پیش کیے گیے، آپؐ نے نہ ان کے لباس اتروائے، اور نہ ان کے اسلحہ ضبط کیے، اور نہ ان کو قتل کر دینے کا حکم دیا، بلکہ عفو و درگذر سے کام لے کر ان کو چھوڑ دیا، طبری کی یہ بھی روایت ہے کہ ایک صحابی زُنَیم وادی حدیبیہ کے ایک بلند ٹیلے پر کھڑے تھے، کہ مکہ کے غیر مسلموں نے تیر کا نشانہ بنا کر ان کو ہلاک کر ڈالا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے خلاف ایک رسالہ بھیجا، جو دشمن کے بارہ[12] سواروں کو گرفتار کر کے آپؐ کے پاس لایا، آپؐ نے ان سے فرمایا، کیا میں نے تم سے کوئی عہد کیا ہے، جس کا ایفا لازم ہو؟ انھوں نے کہا نہیں آپؐ نے پھر اپنی شانِ رحمت دکھائی اور انکو چھوڑ دیا، اسی موقع پر اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

هُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ	اللہ وہ ہے جس نے مکہ میں ان کے
عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم	ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے
بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ	روکے، اس کے بعد تم کو ان پر
أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ (فتح)	قابو دیدیا تھا،

صلح کی گفتگو ناتمام رہی، تو رسول اللہؐ نے خراش بن امیہؓ کو اپنے اونٹ پر مکہ بھیجا کہ وہاں اشراف کو آپ کے آنے کی غرض بتائیں، حضرت خراشؓ بن امیہ

مکہ پہونچے تو وہاں کے لوگوں نے انکے اونٹ کو مار ڈالا اور ان کو بھی قتل کر دینے کا ارادہ کیا، مگر حبشیوں کی حمایت سے بچ کر وہ رسول اللہ صلعم کے پاس چلے آئے اس کے بعد مکہ کے لوگوں نے چالیس پچاس آدمیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرودگاہ تک بھیجا کہ آپ کے ساتھیوں کو قتل کریں، یہ سب گرفتار ہو کر آپ کے سامنے پیش کیے گئے، آپ کا دامنِ عفو پھر وسیع ہوا، اور ان کو بھی معاف کر کے رہا کر دیا،

اس کے بعد آپ نے صلح کا پیام دے کر حضرت عمر فاروق رضی کو بھیجنا چاہا، لیکن انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ میرے قبیلہ میں عدی والوں میں سے کوئی وہاں نہیں جو میری حمایت کر سکے، قریش کا میں سخت دشمن ہوں اس لیے وہ میری بات ماننے کے بجائے میری جان کے درپے ہوں گے، میرے بجائے عثمان رضی بن عفان زیادہ بہتر ہوں گے، کیونکہ وہاں انکی عزت اور اثر ہے، چنانچہ آپ نے حضرت عثمان رضی بن عفان کو یہ پیام دکر بھیجا کہ لڑائی کرنا مقصد نہیں، بلکہ کعبہ کی زیارت مقصود ہے، حضرت عثمان رضی یہ پیام لے کر پہونچے تو مکہ کے غیر مسلموں نے ان سے کہا کہ ان کا جی چاہے تو کعبہ کا طواف کر سکتے ہیں،

انھوں نے طواف کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ رسول اللہ صلعم کے بغیر طواف نہیں کر سکتے، اس پر ان کو مکہ کے لوگوں نے اپنے یہاں روک لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خبر پہونچی کہ وہ شہید کر دئے گئے، یہ سن کر فرمایا کہ اب جب تک دشمنوں سے فیصلہ کن لڑائی نہ لڑ لونگا یہاں سے واپس نہ جاؤنگا، یہ کہہ کر آپ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہ سے جان نثاری کی بیعت لی، اس کا نام بیعتِ رضوان ہے،

جب غلط فہمی دور ہوئی تو مکہ والوں نے سہیل بن عمرو کو یہ پیام دکر بھیجا کہ صلح صرف اس شرط پر ہو سکتی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سال واپس چلے جائیں،

آپ نے حضرت علی رضی کو بلا کر حکم دیا کہ معاہدہ کے الفاظ قلمبند کریں، سہیل بات بات پر اڑتا، مگر آپ اپنی رواداری میں اس کی ساری باتیں تسلیم کرتے گئے، حضرت علی رضی نے عنوان پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا، سہیل نے کہا کہ میں اس جملہ کو نہیں جانتا، اس کے بجائے، باسمک اللّٰھم لکھو، رسول اللہ صلعم نے حضرت علی رضی سے کہا یہی لکھ دو، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ آگے لکھو، یہ وہ معاہدہ ہے، جس پر محمد رسول اللہ نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی ہے، اس پر سہیل نے کہا، اگر ہم اس بات کو مانتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو پھر کیوں لڑتے، اس کے بجائے آپ اپنا محض نام اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے راضی ہو گئے، اور حضرت علی رضی سے کہا کہ لکھو کہ یہ وہ شرائط ہیں جس پر محمد صلعم بن عبد اللہ نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی ہے، اس کے بعد یہ شرائط قلمبند کی گئیں کہ دس سال تک ایک دوسرے سے لڑائی نہ ہوگی، اس مدت میں ہر شخص محفوظ رہے گا، کوئی کسی پر دست درازی نہیں کرے گا، قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مدینہ پہونچ جائے گا، تو وہ اس کے ولی کے پاس بھیجدیا جائے گا، اور اگر مدینہ سے کوئی قریش کے پاس چلا جائے گا، تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا، اب نہ تلوار نکلیگی، نہ تیر اندازی اور نہ سنگ اندازی ہوگی، جس کا جی چاہے، فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہے معاہدہ میں شریک ہو جائے، ان شرائط کے ساتھ یہ شرطیں بھی رکھی گئیں کہ مسلمان اس سال مدینہ واپس چلے جائیں، مکہ کے اندر نہ آئیں، آئندہ سال وہ آئیں تین دن قیام کریں مگر ان کی تلواریں نیام میں رہیں۔

یہ شرطیں مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں، صحابہ کو بڑا دکھ ہوا، حضرت عمر فاروق رضی تو

اسی دکھ میں رسول اللہؐ کے پاس پہونچے اور عرض کیا کیا آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں آپؐ نے فرمایا ہوں، حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں، آپؐ نے فرمایا ہو" حضرت عمرؓ نے کہا کیا اہل مکہ مشرک نہیں ہیں، آپؐ نے فرمایا" ہیں" حضرت عمرؓ نے کہا تو پھر ہم کیوں دین کے معاملہ میں اپنی کمزوری تسلیم کرلیں، آپؐ نے فرمایا میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، ہرگز اس کے حکم کی مخالفت نہیں کرونگا، وہ کبھی میری بات نہیں بگاڑیگا، حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ اس خوف سے کہ مجھے اپنی اس بات کا کوئی خمیازہ اٹھانا پڑے" میں اُس روز سے برابر روزے رکھتا صدقہ دیتا، نمازیں پڑھتا، اور غلام آزاد کرتا رہا یہاں تک کہ میرے قلب کو اطمینان ہو گیا، صلح کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے اونٹ ذبح کئے، بال ترشوائے، اور احرام کھولا اسی کے بعد سورہ انا فتحنا لک فتحا مبینا نازل ہوئی، اور یہ فتح اس لحاظ سے ضرور تھی کہ صلح حدیبیہ سے فتح مکہ تک جتنی تعداد میں غیر مسلم مسلمان ہوئے، پہلے کبھی نہیں ہوئے غیر مسلم مسلمانوں سے ملنے لگے تو رسول اللہؐ نے اپنی تعلیمات سے انکے اخلاق کو جتنا پاکیزہ بنا دیا تھا، اسے دیکھ کر متاثر ہوتے اور اسلام قبول کرتے، صلح حدیبیہ کا اس لحاظ سے بھی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس کس طرح ہر موقع پر اپنی رواداری فراخدلی اور انسان دوستی کی مثال پیش کی جسکا نمونہ مشکل سے کسی اور تاریخ میں مل سکتا ہے، بعض صحابہ کرام کی بیویاں مکہ میں رہ گئی تھیں انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا ان کو زور اور جبر ڈال کر انکو مسلمان کیا جا سکتا تھا، مگر صحابہ نے زبردستی کرنے کے بجائے انکو طلاق دے کر علحدگی اختیار کرنے کو زیادہ پسند کیا، صلح حدیبیہ کی تفصیل کیلئے دیکھو بخاری شریف کتاب الشروط، تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم ص ۳۰۶-۳۵۶-عربی ۱۵۵-۱۵۲۸، نیز سیرۃ النبی جلد اول ص ۶۱۰-۴۴۴، الفاروق ص ۴۰۸-۵۴، تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی ج اول ص ۵۰-۴۹)

(باقی)

جدید عربی شاعری کا تنقیدی مطالعہ

از ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی صدر شعبہ عربی کالی کٹ یونیورسٹی

(۲)

اس ذہنی اور تہذیبی اختلاف کا اصل مظہر مصر ایک جانب جامعہ مصریہ ہے جہاں اعلی یورپی تعلیم ہوتی ہے، اور دوسری جانب جامعۂ ازہر ہے جہاں ادبی و اسلامی علوم کی اعلی تعلیم دیجاتی ہے، زندگی کے یہی سوتے ہیں جہاں سے عرب ذہنی غذا حاصل کرتے ہیں ان کیفیات کا اثر شاعری پر بھی مرتب ہوا ہے، شعرا بھی جدید و قدیم خیال کے حامل ہیں اور نثر نگار بھی۔

یہ مطالعہ صحیح ہے کہ ادب کو زندگی کا عکاس ہونا چاہئے، اور ملکی و سماجی مسائل بھی اس کے دائرہ میں شامل ہونے چاہئیں، اس لئے ضروری ہے کہ عربی شاعری میں عوام کے آلام و افکار کو جگہ ملے اور ایسے بلند آہنگ نغمے پیش کئے جائیں جو زندگی کو سوز و سرور، لذت و الم اور روشنی و تابندگی سے آشنا کر سکیں اگر معاشرہ پر غم کا سایہ ہو تو نغمے بھی غم انگیز ہوں اور معاشرہ مسرت سے ہمکنار ہے تو نغمے بھی مسرت افروز ہوں دلوں کو نشاط کی شبنم ملے اور کلیوں کو تبسم عطا ہو

قدیم شاعری کا دامن اجتماعی رجحانات سے خالی ہے،

ڈاکٹر احمد امین لکھتے ہیں کہ جدید تعلیم یافتہ نوجوان جب عربی شاعری کا قدیم سرمایہ کھنگالتا ہے، تو اس کو بڑی مایوسی ہوتی ہے، اور جدید سرمایۂ شاعری میں بھی اس کو ذہنی سکون کا سامان خاطر خواہ نہیں ملتا، اس لیے وہ مغرب کے شعر و ادب اور افسانہ و روایت کے دامن میں پناہ لیتا ہے، وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے نقائص کو محسوس کریں، اپنے ادبی ذخیرہ کا جائزہ لیں اور اپنی شاعری کو اس قدر بلند اور وسیع کر دیں کہ وہ ہماری قومی زندگی کی

ترجمان بن جائے، اس کے اندر جذبات فطرت، اسرار کائنات اور مناظر قدرت کی نقش کشی کے ساتھ معاشرہ کی کمزوریوں کا بیان ہو، قوم کو اعلیٰ انسانی صفات اور بلند اخلاقی اقدار کی جانب ایسے موثر، دل پذیر انداز میں توجہ دلائی جائے کہ اعلیٰ مغربی تعلیم یافتہ عربوں کے دل ملک وملت کی محبت سے سرشار ہو جائیں۔[1] جدید شاعر زندگی ومسائل زندگی کی تصویر کشی، ایسی رنگینی ورعنائی کے ساتھ کرتا ہے، کہ لوگ اس کے اشعار پڑھکر جھومنے لگتے ہیں، عوام محسوس کرتے ہیں، مگر اپنے احساس کو فنی قالب عطا کرنے سے قاصر رہتے ہیں، مگر شاعر وفنکار احساس کو فن میں ڈھالنا، اور مصور کرنا جانتا ہے،

حافظ کے متعلق مشہور ہے کہ ہوٹل چلے جاتے اور وہاں کسی واقعہ کے متعلق لوگوں کے خیالات وافکار معلوم کرنے کی کوشش کرتے، جب انھیں کسی سیاسی یا قومی یا اجتماعی زندگی کے بارے میں عوامی احساس کا صحیح اندازہ ہو جاتا تو اس کو نظم کے قلب میں ڈھال دیتے، ممکن ہے، کسی کو ان کا یہ طرز عمل پسند نہ ہو مگر اس کے اندر عوام کے احساسات کا احترام ضرور محسوس ہوتا ہے،

دراصل دور جدید کی شاعری میں ایک بنیادی تغیر نظر آتا ہے، قدیم ادوار میں شاعری کا تعلق ایک خاص پڑھے لکھے طبقہ سے تھا، عوامی زندگی کے لذت والم اور حزن وسرور کی عکاسی سے سروکار نہ تھا، مثلاً، اخطل، فرزدق، جریر، بشار، ابونواس، ابن الرومی، متنبی، ابوتمام اور بحتری وغیرہ کا مطالعہ کیجئے تو مسائل حیات کے مرقعے سامنے نہیں آتے کہیں کہیں تجربات حکیمانہ نکات اور فلسفیانہ اشارات ضرور پائے جاتے ہیں، لیکن ان سے عوامی زندگی کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا ہے، مگر جدید شعراء کے دواوین میں

---

[1] فیض الخاطر، ... ص ۹۰

زندگی اپنی چھلکتی، مچلتی اور توانائیوں سے پُر نظر آتی ہے، جدید وقدیم شاعری میں شخصیات کا علبہ رہا اور طبقۂ اشراف کے متعلق مواد فراہم کیا گیا ہے، مگر جدید شاعری میں عوامی واجتماعی زندگی کا رنگ غالب ہے، اس کے اندر انسانی مسائل کے ساتھ حسن فطرت کی منظر کشی، آثار قدرت کی نقاشی اور جمال کائنات کی رنگ آرائی کا ایسا دل آویز بیان ملتا ہے کہ پرانے شاعروں کے یہاں اس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے، جدید شاعر زندگی کی خوابیدہ رعنائیوں کو بیدار کرتا ہے، اور اپنی شاعری کو نیا آب ورنگ بخشتا ہے،

بلاشبہہ اس میدان میں یورپی شعراء نے زیادہ معنی خیز، وسیع اور دلکش اسالیب اختیار کیے ہیں، جو معانی کی گہرائی اور مشاہدات کی وسعت سے لبریز ہیں، اسی بناپر ڈاکٹر احمد امین کا خیال ہے کہ جدید عربی شاعری ان موضوعات پر اپنے اندر وہ عظمت وکمال پیدا نہ کر سکی جسکی بناپر وہ یورپی شاعری کا مقابلہ کر سکے، لیکن اس موقع پر انھوں نے یہ نہ سوچا کہ یورپ کی تہذیبی ترقی کو طویل عرصہ گذر چکا ہے، عربوں نے ان کے بہت بعد ترقی کی راہ پر قدم رکھا، یہ سچ ہے کہ یورپ سے صدیوں پہلے عربوں نے زندگی کو نئے آفاق دکھائے تھے، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کے بعد وہ اتنے گہرے گڑھے میں گر گئے کہ ابتک اس سے نہ نکل سکے۔

مصر میں جو تحریک تجدید اٹھی، اس میں زندگی تھی، اس کے روح رواں عقاد مازنی اور عبدالرحمٰن شکری تھے، لیکن یہ لوگ اس خیال پر قائم نہیں رہے مازنی نے جدید شاعری کو چھوڑ کر نثر نگاری اختیار کر لی، عقاد البتہ بڑی حد تک اس راہ میں آگے بڑھتے رہے، تجدید کی ایک دوسری تحریک امریکہ میں تارک وطن عرب شاعروں نے چلائی میخائیل نعیمہ نے "غربال" لکھکر جدید خیالات کی تائید کی، ان لوگوں کا

مقصد وہی تھا، جو "الدیوان" کے مصنفین عباس محمود عقاد اور ابراہیم عبد القادر مازنی کا تھا، ادب کے تمام اہم تقلیدی عناصر پر تنقید کر کے تقلید کے عیوب واضح کیے جائیں، "الدیوان" دس جلدوں میں شائع ہونے والی تھی مگر دو ہی جلدیں منظر عام پر آسکیں اگرچہ تجدید کے داعیوں نے اپنے خیالات کی ترتیب، اشاعت اور فکر کا کوئی مرکز قائم نہیں کیا، مگر چونکہ یہ وقت کی آواز تھی، اس لیے کامیاب ہوئی۔[1]

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ تجدید کی دعوت کی کامیابی سے عربی شاعری کا قدیم مدرسۂ فکر ختم نہیں ہوا، گو اس کے اہم ارکان ختم ہو گئے، لیکن اب بھی عربی شاعری میں قدامت کے عناصر موجود ہیں، اس وقت بارودی شوقی، حافظ، عبد المطلب اور جارم موجود نہیں ہیں مگر ان کے نغمے اب بھی جدید شاعری کی روح ہیں، اور ان کے اثرات محمد اسمر، محمود غنیم، علی الجندی، اور عزیز اباظہ وغیرہ کی شاعری میں آسانی سے تلاش کیے جا سکتے ہیں، بات یہ ہے کہ معنوی اشیا میں تقلید کی عمر بہت طویل ہوتی ہے، اور اس کی جڑیں کافی مضبوط ہوتی ہیں۔[2]

بہر حال جدید عربی شاعری کے ہر طبقۂ فکر میں چند ایسے بنیادی عناصر پائے جاتے ہیں، جو مشترک ہیں، مثلاً حریت پسندی، وطن دوستی، وحدت ملت عربیہ، یہ جدید عربی شاعری کے وہ بنیادی عناصر ہیں جن کا وجود ہمیں قدیم شاعری میں نہیں ملتا، عربوں کا خیال ہے کہ انھوں نے آزادی کے لیے صدیوں سے جد و جہد جاری رکھی ترکوں کے دور کو وہ غلامی کا دور سمجھتے ہیں،[3]

سلہ الشعر المصری بعد شوقی تالیف محمد مندور، ۱۹۵۷، ص ۱۱، ۲، ۳، سٹہ الشعر المصری بعد شوقی ص ۲، ۵، سٹہ دراسات ادبیۃ تالیف عمر الدسوقی ج ۱، ص ۱۲۰

مصر و شام آزادی کی جد و جہد میں بہت آگے رہے ہیں، یہاں کے شعرا و ادبا نے وطنیت کے جذبات کی بڑی دردانگیز ترجمانی کی ہے، شامی شعرا نے بھی اس وطنی شاعری میں نمایاں حصہ لیا، اور مغرب کی سیاسی مکاریوں کو واضح کیا،

تقسیم فلسطین کے سلسلہ میں نوجوان عرب شاعروں کے قومی و ملی احساسات کو ان اشعار میں ملاحظہ کیجئے، باکثیر کہتا ہے۔[1]

قد بدا انا الکفاح   و شحذ نا السماح

ہم نے جد و جہد شروع کر دی ہے، اور اپنے نیزوں کو تیز کر دیا ہے،

جب جمہوریہ عربیہ مصر و شام سے مل کر وجود میں آئی تو عرب شعرا کے جذبات وحدت ابھر آئے، عبد الغنی حسن کے چند اشعار اس سلسلہ میں ملاحظہ ہوں،

ایا ارض الکنانۃ قد تجلت   لک الآفاق و انقشع القتام

اے ارض کنانہ۔ تیرے لیے آفاق روشن ہو گئے، اور اندھیرا چھٹ گیا۔

و لاحت فی السماء خیوط فجر   لہ فی مطلع الشرق ابتسام

آسمان پر سحر کے آثار نمایاں ہیں مطلع مشرق اس سحر سے متبسم نظر آرہا ہے،

متحدہ عرب جمہوریہ نے جب زرعی اصلاح کے قوانین نافذ کئے اور کسانوں کے ساتھ مراعات روا رکھیں اور انھیں زمینیں عطا کیں تو مصری شعرا نے اس تحریک اصلاح میں پورا حصہ لیا، چند اشعار ملاحظہ ہوں، احمد عبد الحمید الغزالی کہتا ہے،[2]

ایھا السادرون فی ظلمۃ الکوخ   افیقوا علی ائتلاق الصباح

اے جھونپڑی کی تاریکیوں کے پریشاں حال، بیدار ہو جاؤ، صبح نمایاں ہو گئی،

سلہ دراسات ادبیہ ص ۱۲۹ سٹہ ایضاً ص ۱۳۲

طال فینا انتظارہ ثم وافی بغدٍ مشرق علی مصر ضاحی

جس کا انتظار بہت طویل ہو چکا تھا، پھر وہ صبح روشن مصر پر روشن دن لیکر آئی

عربوں کی عملی زندگی میں تو بہت اختلافات ہیں، باہمی اتحاد ہنوز ایک خواب ہی ہے. مگر جذبات خاص طور سے عرب شعرا کے یہاں ہر جگہ یکساں نظر آتے ہیں، وحدت ملت عربیہ ہر جگہ نمایاں ہے. مثلاً ایک مشہور شامی شاعر خیر الدین زرکلی مصر کی تعریف کرتا ہے کہ وہاں کے لوگوں نے شامیوں کی مدد کی اور ان کی آزادی کی جدوجہد میں وہ بھی برابر شریک رہے۔[1]

غضبت فئۃ لسوریۃ الشہید‌ۃ فی مصر تطفی غلّۃ الامصار

مصر میں ایک جماعت "شام شہید" کے لیے غضب ناک ہوئی جو ممالک عربیہ کی پیاس بجھا رہی ہے یعنی مصر میں ایک جماعت نے شام میں مظالم کے خلاف آواز اٹھائی،

ورعت لہا ذمم الوفا لم یضیع عہد تسلسل فی ذمم الاعصار

وفا کے عہد کی اس نے رعایت کی اور خون کے زمانوں میں اپنے عہد پر قائم رہی،

جدید شعراء میں مصر سب سے آگے ہے پھر لبنان، شام اور عراق سامنے آتے ہیں عراق نے زہاوی و رصافی جیسے شاعروں کو جنم دیا، شام و لبنان نے مہجری شاعری کو پروان چڑھایا، مذکورہ تمام مباحث پر نظر ڈالنے سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے، کہ جدید عربی شاعری قدیم شاعری سے بہت مختلف ہے،

موضوعات شاعری بالکل بدل گئے ہیں، جدید شاعری کے بنیادی عناصر قومیت عربیت اور اسلامیت ہیں، مختلف ممالک کے عرب شعراء اپنے اپنے قومی و وطنی جذبات رکھتے ہیں، مگر تمام عربوں کو بھی مخاطب کرتے ہیں، اسلام کا ذکر بھی تقریباً

[1] دراسات الادبیہ ص ۱۰۹

تمام شعراء کے یہاں ہے، مگر اس کے تصور میں کہیں کہیں مغربی خیالات کا عکس بھی نظر آتا ہے، بعض شعراء اسلام کو بحیثیت مذہب ایک ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں، عربوں کے اتحاد کی بنیاد عربیت کو قرار دیتے ہیں، اس سلسلہ میں وحدت جنس، وحدت زبان وحدت عقیدہ کا نام لیتے ہیں۔[1]

جدید تہذیب میں شام کا حصہ کچھ کم نہیں رہا، شام میں جدید عربی ادب نے غیر معمولی ترقی کی اور کئی ایسی اعلیٰ قسم کی علمی و ادبی انجمنیں وجود میں آئیں جنھوں نے سارے عالم عربی میں امتیاز پیدا کر دیا، جیسے شام کی "المجمع العلمی العربی" ان انجمنوں نے اور اشخاص نے انفرادی طور پر بہت سی کتابوں کے ترجمے کئے، جدید رجحانات نے شام میں تین عناصر کو جنم دیا ایک قومی دوسرا وطنی اور تیسرا انسانی[2]

قومیت کے اثر سے شامی شعراء اور عام عرب شعراء نے اصلاح کا پیغام عام کیا اور اس سلسلہ میں تاریخ سے مدد لیکر آباء و اجداد کے کارناموں کو سامنے لائے، اور عربوں کا عہد زریں انھیں یاد دلایا، شیخ ناصف الیازجی کہتے ہیں،

لعمرک نحن مصدر کل فضل وعن آثارنا اخذ الانام

تیری عمر کی قسم ہم ہر فضیلت کا مرجع ہیں اور دوسروں نے ہمارے کارناموں سے سبق حاصل کیا ہے،

ونحن اولو المآثر من قدیم وان جحدت مآثرنا اللئام

اور ہم قدیم زمانہ سے صاحب آثار ہیں، اگرچہ کم ظرف لوگ ہمارے کارناموں کا انکار ہی کیوں نہ کریں۔

[1] دراسات آدبیۃ ص ۱۰۷، ۱۱۱، ۱۱۲، [2] محاضرات فی الاتجاہات الفکریۃ فی بلاد الشام و اثرہا فی الادب الحدیث۔ تالیف ڈاکٹر جمیل صلیبا ص ۴۴

عبد الرحمن رافعی کہتا ہے،

ولنا آثار ھم تذکارھا یھب الضمائر قوة الایمان

اور ان کے ایسے آثار ہیں جنکا ذکر ضمیر کو قوت ایمانی بخشتا ہے۔

تتفاخر الاجیال فی اخبارھم والشمس لا تحتاج الی ابرھان

ایسے کارنامے ہیں، جن کا ذکر کر کے قومیں فخر کرتی ہیں اور سورج کسی دلیل کا محتاج نہیں ہوتا۔

سلیمان تاجی فاروقی کہتا ہے،

بنی انھضوا واحیوا حیاة عزیزة حیاة تعید المجد للعرب ثانیا

اے بیٹو (اہل عرب) اٹھو اور ایسی باعزت و سطوت زندگی حاصل کرو جو عربوں کی عزت وحشمت کو دوبارہ واپس لے آئے،

خلیل مردم بک شام کی غلامی کا ذکر کر کے کہتا ہے،

واذ کانت حیاة المرء اسرا فان الموت بالاحرار احری

جب انسان کی زندگی مقید ہو جائے تو پھر آزاد انسانوں کیلئے موت ہی بہتر ہے،

شفیق جبری اہل یورپ کے نعرۂ امن کا مذاق اڑاتا ہے اور کہتا ہے،

قالوا السلام وما ارای للسلم من ظل مدید

لوگ کہتے ہیں امن لیکن میں امن کے سایہ کو لمبا نہیں پاتا۔

اخلاقی و انسانی قدریں بھی ان جدید شامی شعراء کے یہاں موجود ہیں، مثلاً

امجد الطرابلسی کہتا ہے،

کن رحیما وانما الانسان ذو القلب الرحیم

رحم دل بنو اس لیے کہ انسان وہی ہے، جو رقیق القلب ہو،

جدید شامی شعراء میں بعض تو اس قدر تجدد پسند ہیں کہ وہ مغربی تہذیب کو من و عن اختیار کر لینے کو قوم کی ترقی کا راز سمجھتے ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ اگر کچھ جدید اور کچھ قدیم کو ملا کر کوئی تہذیب بنی تو وہ ناقص ہوگی، لیکن اس کے برعکس اعتدال پسند طبقہ کا خیال ہے کہ جدید و قدیم کی حسین آمیزش ہی ہماری عربیت و اسلامیت کو باقی رکھتے ہوئے ہمیں جدید مادی ترقی تک پہونچا سکتی ہے۔[1]

شام میں ایسے شعراء کا بھی ایک طبقہ موجود ہے، جو موروثی تقالید پر اعتقاد کامل رکھتا ہے۔ ان لوگوں کو "المحافظون" کہا جاتا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں، پہلا طبقہ تو وہ ہے جو قدیم اقدار حیات میں کسی تغیر کو ممکن نہیں سمجھتا، اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو مغرب کی غلط و صحیح ہر قسم کی تقلید کے انجام سے ڈرتا ہے،[2] یعنی محتاط ہے،

ادیب التقی[3] کہتا ہے،

یا ایھا الشبان احرقتم شبابکم بالامل المحترق

اے نوجوانو! تم نے اپنی جوانی کو ایک آتشین امید سے جلا ڈالا

ان قومی و ملی جذبات کے علاوہ دینی رجحان بھی شامی شعراء میں موجود ہے، چنانچہ خلیل مردم بک عمر ابوریشہ اور انور عطا کے یہاں دینی جذبات بڑی وضاحت سے ہم کو ملتے ہیں، خیر الدین زرکلی، عدنان مردم بک وغیرہ نے بھی دین کو بنیادی اہمیت دی ہے ایسے شعراء کے بہت قصائد خدا اور حضور انور صلعم کی شان میں موجود ہیں۔[4]

خلیل مردم بک کہتا ہے،

---

[1] الاتجاہات الفکریة فی بلاد الشام ص ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، [2] الاتجاہات الفکریة فی بلاد الشام ص ۱۳۹ [3] ایضاً ص ۱۷۷، ۱۷۸

سبحانک اللّٰھم انت اکبر — من ان یحیط بکنھک المتفکر

تو پاک ہے اے خدا، تو اس سے بہت بلند ہے کہ کوئی مفکر تیری کنہ کو پہونچ جائے

حار اللبیب وزاغ عنک المبصر — ورمی فاخطأ سھمہ المتدبر

عاقل حیرت زدہ ہے اور صاحب بصارت سے تو اوجھل ہے اور غور کرنے والے کی رسائی

سے تو پرے ہے،

اقصی مدی فیک تحیر

آخر حد تیرے بارے میں تحیر ہے،

شفیق جبری حضورؐ کو مخاطب کر کے کہتا ہے،

بعثت الصفا فی عالم الارواح — وجنبتھا القلی والخصاما

آپ نے روحوں کو پاکی بخشی اور ان کو ناراضگی اور جھگڑے سے محفوظ کر دیا،

شعرائے عراق نے بھی عربی شاعری کے جدید رجحانات کو پوری طرح اپنایا، اور نئے خیالات کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دیا۔ ان شعراء میں دو شاعروں کو خاص امتیاز حاصل ہے، یعنی جمیل صدقی زہادی اور معروف رصافی کو

جمیل صدقی زہادی نے عربی شاعری کو اپنے بلند پایہ خیالات اور حریت پسندی سے مالا مال کر دیا۔ سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کے ہر ہر پہلو کو اس نے اپنی شاعری کا موضوع قرار دیا، آزاد خیالی اور اصلاح امت عربی اس کی شاعری کے اہم پیغامات ہیں، غور و فکر کی دولت قدرت نے اس کو جی بھر کر عطا کی تھی، انھیں خیالات کی بلندی و پاکیزگی کی بنا پر عرب اسکو "فیلسوف" کہنے لگے،[۵] اگرچہ لوگ شوقی کو عصر جدید کا تبنی

[۱] ملاحظہ ہو الادب العصری فی العراق العربی قسم المنظوم المطبعۃ السلفیۃ بمصر ۱۹۲۳ء تصنیف رفائیل بطی ص ۵

کہتے ہیں، لیکن فکری، نقطۂ نظر سے اگر غور کیا جائے تو زہادی عصر جدید کا تبنی تھا، اور اس کے یہاں فلسفیانہ افکار پائے جاتے ہیں۔ اس نے جو کتابیں نثر میں لکھی ہیں، وہ خاص طور سے غور و فکر کے لائق ہیں ان کتابوں میں زہادی نے طبیعیات کے بہت سے مسائل پر غور کیا ہے، اور نتائج اخذ کئے ہیں،

زہادی اس طرز شاعری کو پسند کیا کرتا ہے، جو عصر عباسی کی ترجمان تھی، طرز قدیم کو چھوڑ کر زہادی نے معاشرہ کی غلط روی، بے عملی و بے حسی اور انحطاط پذیر سماج کی کمزوریوں کی نشان دہی کو اپنی شاعری کا مرکز قرار دیا، عورت جو سوسائٹی میں بہت مظلوم تھی، اس کے حقوق کے لیے زہادی نے اپنے کلام میں پر زور وکالت کی، اور اس سلسلہ میں بہت سی نظمیں لکھیں۔[۱]

اس طرز کا دوسرا عراقی شاعر معروف الرصافی بھی قابل ذکر ہے، شاعرانہ صلاحیت کے اعتبار سے وہ زہادی سے بہت آگے تھا، لیکن وہ جدید علوم سے واقف نہ تھا، ورنہ وہ دور جدید کے تمام شعراء پر سبقت لے جاتا۔[۲]

وہ دور جدید کا ایسا شاعر ہے، جس کے کلام میں کسک ہے، درد ہے، اور امت اسلامیہ کا نوحہ ہے، عبد الحمید کے مظالم کے خلاف جو آواز رصافی نے اٹھائی ہے، وہ درد انگیز بھی ہے، اور جرأت رندانہ کی آئینہ دار بھی۔[۳]

ٹریجڈی کے نقطۂ نظر سے رصافی کو دور جدید کے تمام شعرائے عرب پر امتیاز حاصل ہے، غم انگیز نظموں نے اس کی شاعری کو دل دوز و جگر سوز بنا دیا ہے، اسکے کلام میں محض اجتماعی زندگی کی عکاسی نہیں ہے، بلکہ معاشرہ کے نقائص کی نشاندہی

[۱] الادب العصری ص ۶ [۲] الادب العصری ص ۶۷ [۳] الادب العصری ص ۷۰

کے ساتھ ایک خاص مصلحانہ شان بھی ہے، رصافی کی حقیقی شاعری بھی قابل ذکر ہے،
اس میں انھوں نے بڑے اعلیٰ اور دقیق خیالات پیش کیے ہیں،

"ام الیتیم"، "الیتیم فی العید" اور "المطلقة" وغیرہ ان کی نظمیں حقیقی شاعری کا بہترین نمونہ ہیں،[1]

دور جدید کا ایک اور عراقی شاعر شیخ عبدالمحسن الکاظمی کی شاعری میں بھی بلندی، حریت اور صداقت نمایاں ہے، ترنم ان کی شاعری کا خاص امتیاز ہے، حافظ نے درحقیقت ترنم کاظمی ہی سے لیا ہے،[2] کاظمی کی شاعری کا اصل مرکز آزادیٔ ملت اسلامیہ ہے، سید جمال الدین افغانی جب ایران سے جلاوطن ہو کر بغداد پہونچے تو کاظمی انکے خیالات سے بہت متاثر ہوئے اور بعد میں محمد عبدہ کا بھی اثر پڑتا رہا، اس تاثر نے انکی شاعری کو ایک خاص آب و رنگ عطا کیا،[3]

ان تینوں کے علاوہ محمد حبیب العبیدی، رضا الشبیبی، خیری الہنداوی، کاظم الدجیلی، علی الشرقی، محمد الہاشمی، عبدالحسین الازدی، مہدی البصیر، ابوالمحاسن اور محمد السماوی وغیرہ بھی مشہور ہیں، اگرچہ ان کا شمار درجۂ اوّل کے شعراء میں نہیں ہے،

عربی شاعری کے دور جدید میں شعراء دو مدرسۂ ہائے فکر میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں، فکر کے یہ دونوں مدرسے پہلو بہ پہلو ہر جگہ عربی شاعری کے دور جدید میں تلاش کیے جا سکتے ہیں، ان دونوں نظریہ ہائے فکر میں اصل فرق تجدید اور روشن خیال تقلید کا ہے، بارودی، شوقی، حافظ اور اسمٰعیل صبری وغیرہ اگرچہ قدماء کے مقلد نظر آتے ہیں مگر یہ تقلید روشن خیالی پر مبنی ہے، اور بڑی حد تک یہ لوگ آزاد خیال ہیں اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ عربی شاعری کی جدید روایتوں کو ان لوگوں نے توڑکر

---

[1] الادب العصری ص ۷۹ [2] ایضاً ص ۹۰ [3] ایضاً ص ۹۱، ۹۲

سماج کی ترجمانی کی ہے، زبان او معانی دونوں لحاظ سے،

دوسرا طرز فکر خالص مغربی ہے، جو اجتہاد و تجدد پر اپنے فکر کی بنیاد رکھتا ہے، اس مدرسۂ فکر میں بھی کئی گروہ ہیں،

۱۔ ایک طبقہ ان لوگوں کا ہے، جنھوں نے عربی زبان و ادب کو پہلے خوب محنت سے حاصل کیا، پھر مغربی علوم کا گہرا مطالعہ کیا اور زندگی کے ہر افکار و نظریات میں ان سے روشنی حاصل کی، اس طرز کے شعراء نے خالص عربی اسلوب میں جدید خیالات کی ترجمانی کی جس میں عربیت کی شان اور عربوں کی بلاغت پوری طرح پائی جاتی ہے، عقاد، مازنی، شکری اور عبدالرحمٰن صدقی وغیرہ اس فکر کے حامل اور اس مدرسہ خیال کے ترجمان ہیں، یہ لوگ دو چیزوں میں ممتاز ہیں،

ایک تو یہ کہ ان کے افکار نے عربی شعر و ادب میں نفسیاتی نقطۂ نظر پیش کیا اور ادب کے متشابہ قالب کا خاتمہ کر دیا۔

دوسرا امتیاز ان شعراء کو یہ حاصل ہے کہ انھوں نے شاعری کو ایک پیغام بنا کر پیش کیا ہے، اور شعر و ادب کے اس طرز اسلوب پر ضرب کاری لگائی، جس کا محور اشخاص ہوتے تھے، اور جس میں وہ شاعر سے زیادہ ندیم معلوم ہوتا تھا،

اس طبقہ نے مروجہ اصنافِ سخن کے علاوہ شاعری کو عام انسانی قدروں سے ہم آہنگ کیا، اگرچہ بعض شعراء پر فکر کا ایسا غلبہ ہو گیا کہ انکے کلام میں جذبات اور رقت باقی نہیں رہ گئی۔[1]

مجددین میں دوسری فکر کے شعراء وہ ہیں جن کے اندر عربیت مفقود ہے، وہ

---

[1] التجدید فی الادب المصری الحدیث ص ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵،

عربی اوزان، اسالیب بیان اور صحت زبان سے بہت کم واقف ہیں، یہ دراصل نوجوانوں کا وہ طبقہ ہے، جس کی فکر کا سرچشمہ مغرب ہے، ان لوگوں کے یہاں زبان وبیان کی بہت سی خامیاں ہیں، بحور و اوزان سے تو بالکل ہی ناواقف ہیں[۵]،

جدید عربی شاعری کا یہ تغیر دراصل نظام حیات کی تبدیلی کا مظہر ہے، قدیم شاعری استقراطی انداز فکر کی علمبردار ہے، مگر جدید شاعری میں جمہوری روح جلوہ گر ہے، نئی شاعری میں انسانیت، غم گساری، دبے ہوئے طبقہ کی حمایت اور اعلیٰ اقدار حیات کی ترجمانی ملتی ہے، اس میں دعوت حریت و استقلال پورے آب وتاب کے ساتھ نمایاں ہے، اسکے اندر مظالم کے خلاف صدائے احتجاج اور معاصی کے خلاف اعلان جہاد ہے، جدید عرب شعراء نے مغربی استعمار کے خلاف جو کچھ لکھا ہے، اس کی تعداد ہزاروں صفحات سے زیادہ ہے، اس کے مظالم کے بیان سے دواوین کے دواوین پُر ہیں، انھوں نے استعماری طاقتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے ساتھ مغرب کی جمہوری اقدار کو اپنانے کی تلقین بھی کی، اس طرح عربی شاعری رفتہ رفتہ امیروں کی بارگاہ سے نکل کر غریبوں کی جھونپڑی تک پہونچنے لگی، شوقی زندگی کے پہلے مرحلہ میں شاہی شاعر تھے، مگر بعد میں قومی شاعر بنے، طٰہٰ حسین لکھتے ہیں کہ کاش شوقی کو قصر کی ملازمت نہ ملی ہوتی تو ان کی عمر کا ایک بڑا حصہ ضائع نہ جاتا، حافظ نے اتنی فنی بلندی تو حاصل نہ کی مگر ان کے یہاں عوام کی زندگی اور ان کے مسائل سے غیر معمولی تعلق محسوس ہوتا ہے،

جدید عربی شاعری میں آزاد نظمیں کثرت سے لکھی گئیں مگر ان کے اندر اعلیٰ افکار پیش نہ کئے جا سکے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جانب زکی ابوشادی کے بعد کوئی دوسرا شاعر

[۵] التجدید فی الادب المصری الحدیث طبع اولی دار الفکر العربی تالیف عبدالوہاب حمودہ ص ۱۳۷

متوجہ نہ ہوا، اگر کوئی صاحب فن اور عظیم المرتبت شاعر اس جانب توجہ کرتا تو یقیناً شاعری کا یہ پہلو بھی ترقی کرتا، ہاں شعرائے مہجر اور شعرائے لبنان نے اس جانب کسی قدر توجہ کی، آزاد نظموں کا خاصا ذخیرہ تیار ہو گیا، مگر اس میں بلندی کی کمی ہے، ایک ناقد نے صحیح لکھا ہے کہ عربی شاعری غنائیت پر مبنی ہے، آزاد و مرسل شاعری میں غنائیت بہت کم پائی جاتی ہے، اس لئے عربوں کے ذوق سخن کو اس سے تسکین نہیں ہوتی، وہ شعر کی تعریف الکلام الموزون المقفیٰ سے کرتے ہیں، بقول مصطفیٰ لطفی منفلوطی بے وزن شاعری عاجزی کی دلیل ہے، بہر حال عربی شاعری میں یہ صنف زیادہ مقبول نہیں ہے، لیکن بہت سے جدید شعراء اس پر طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں،

محمود گاواں

بہمنی دور کا ایک عظیم وزیر

از ڈاکٹر محمد ظفر الہدی سابق استاذ ڈھاکہ یونیورسٹی

"ڈاکٹر محمد ظفر الہدی کے ایک انگریزی مقالہ کا ترجمہ جناب سلطان احمد صاحب ڈھاکہ نے کیا ہے" (معارف)

محمود گاواں کی ہجرا بتدائی زندگی

خواجہ امام الدین محمود بن جلال الدین محمد بن، خواجہ کمال الگیلانی[1] معروف بہ محمود گاواں بحیرۂ قلزم کے جنوبی ساحل پہ واقع حکومت گیلان کے شہر گاوان میں[2] تقریباً ۸۱۳ھ ۱۴۱۰ء میں پیدا ہوا، اس کا خاندان گیلان کے سربرآوردہ خاندانوں میں تھا، اس کے اسلاف گاواں کے بڑے بڑے عہدوں پہ فائز رہ چکے تھے، یہی وجہ ہے کہ لفظ گاوان اس کے نام کا جزو بن گیا۔ خود اس کا بیان[3] ہے کہ اس کے اسلاف اعلیٰ عہدوں پہ فائز تھے، حکمران خاندان سے اسکی قرابت داری بھی تھی،

---

[1] مورخ فرشتہ نے امام الدین نام لکھا ہے، (جلد اول صفحہ ۳۵۸) اس کے باپ کا نام مطلع سعدین میں جلال الدین لکھا ہے (دیکھئے رسالہ اسلامک کلچر جلد سیزدہم جولائی ۱۹۳۹ء صفحہ ۳۰۷ ہارون خان شیروانی کا مقالہ "محمود گاواں کی ابتدائی زندگی اور گیلان سے اس کا رشتہ") صاحب برہان ماثر نے اس کا نام نجم الدین لکھا ہے (صفحہ ۹۸) مناظر الانشاء ورق ایک ب میں اپنا نام محمود بن شیخ محمد گیلانی بتایا ہے، [2] قاوان کی جگہ گاوان زیادہ مروج اور مستعمل ہے (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۸) [3] سخاوی کی تصنیف جلد دہم صفحہ ۱۴۴ تاریخ فرشتہ (بقیہ حاشیہ آگے ص پر)

علاوہ ازیں ان میں سے کچھ ملک کے وزیر بھی رہ چکے تھے۔ اس کا یہ بھی بیان ہے کہ ایام جوانی ہی میں اسے اعلیٰ عہدے پر پہنچنے کی تمنا تھی،[1]

اس کو اپنے ہی ملک میں امتیازی مقام حاصل کرنے کے مواقع تھے، لیکن اسکا دوش نازک اعلیٰ عہدے کا بار نہ برداشت کر سکا[2] اور اپنے خلاف جتھ بندیوں اور سازشوں سے بددل ہو کر اس نے خود ہی جلاوطنی اختیار کر لی اور اپنے اسلاف کا ملک چھوڑ دیا، اس نے اپنی اس بیچارگی کا اظہار ایک قصیدہ میں کیا ہے جسے اس نے بہمنی خاندان کے حکمران ہمایوں شاہ کی مدح میں لکھا تھا،

بندہ را حالیست کان از حضرت نتواں نہفت — از سر لطف کرم یک لحظہ حالم گوش دار
علت غائی ز ہندم نیست الا خاک پات — ورنہ بے آب بقا در ظلمت آدم چہ کار
شد بجائے خود مرا ساکن شدن در ہند از آنکہ — مردم دیدہ بنا شد ساکن الا جائے تار
ایں زمانہ یک مرادست از توائے کان کرم — گر نشد آں حاصل از تو جان کند از تن فرار
گوشۂ خواہم کہ گردم منزوی از کل کون — واں گہے آرم بخاک کوئے وحدت افتخار
غیر ازیں گر باشدم مقصود اصلی در جہاں — چشم دل از کثرت موہوم بادا پُر غبار

(بقیہ ص ۴۴۴) (جلد اول ص ۳۵۰) کے مطابق اس کا سال پیدائش ۸۰۸ھ ۱۴۰۵ء ہونا چاہئے اسکی وفات ۷۰ برس کی عمر میں ۵ صفر ۸۸۶ھ مطابق ۵ اپریل ۱۴۸۱ء میں ہوئی۔ اس سلسلے میں سخاوی کا قول زیادہ معتبر ہے کیونکہ محمود گاواں کا ہم عصر ہے علاوہ ازیں مورخ فرشتہ نے سید عبدالکریم ہمدانی کا قول نقل کر دیا ہے، جسکی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔

[1] ریاض الانشاء ص ۹

[2] ریاض الانشاء، دوش ہوش ایں، ضعیف از احتمال اثقال وزارت مجتنب بود

محمود گاوان ملک التجار

محمود گاوان نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا[1] ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء میں داخل آیا وہاں سے دکن کے عروس البلاد محمد آباد بیدر روانہ ہوا، ایک غیر ملک میں سفر کے دوران اس نے اپنے آپ کو عزم محکم اور زبردست قوت ارادی کا حامل ثابت کیا بیدر میں وہ شاہ نعمت اللہ کرمانی[2] کے خلف شاہ محبیب اللہ کے قدموں میں رہنے کا خواہشمند تھا، لیکن اس کے اندازہ کے برخلاف دکن کے بادشاہ علاء الدین احمد دوئم (۸۳۹-۶۲ھ/۱۴۳۶-۵۸ء) نے اس کا خیر مقدم کیا وہاں اسے ایک ہزار سوار کی کمان سونپی گئی، اور دربار میں ایک عہدیدار کی حیثیت سے افسر مقرر کیا گیا۔ پھر اسے جلال خان کی بغاوت فرو کرنے کے لیے "تلنگانہ" بھیجا گیا، اس مہم کی کامیابی سے اس کے لیے عزت و شہرت کے دروازے کھل گئے، اس کا شمار اونچے طبقہ کے امرار میں ہونے لگا۔ احمد شاہ دوئم کی وفات کے بعد اس کے جانشین ہمایوں شاہ (۸۶۲-۶۵ھ/۱۴۵۷-۶۲ء) نے ۸۶۲ھ میں اسے ملک التجار[3] کے خطاب سے نوازا۔

محمود گاواں۔ خواجہ جہاں

محمود گاواں کے دل میں ان دونوں بادشاہوں کی محبت و تعظیم کا جذبہ موجزن تھا، گیلان کے سلطان کے نام ایک خط میں اس نے علاء الدین کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: "مرحوم بادشاہ کی خوبیوں کے مرہم نے وطن سے ہجرت کے زخم بھر دیئے"[4] اسی خط میں اس نے ہمایوں شاہ[5] کی بھی خوب خوب تعریف کی ہے، جس نے گاوان کی

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۸۔ گاوان جب ہندوستان آیا اسوقت اس کی عمر ۴۳ سال تھی، [2] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۰۔ [3] ریاض الانشار صفحہ ۱۲۱ مکتوب نمبر ۴۹ میں لکھا ہے: "محمود المخاطب من حضرت الخلافہ بہ ملک التجار"، [4] ریاض الانشار صفحہ ۱۰۲۔ [5] ہمایوں شاہ کی مدح میں لکھے گئے قصیدے کا پہلا شعر بھی ملاحظہ فرمائیے:

مین عمرم کز غبار غربت و غم بود تار
شد کنوں روشن ز کحل خاک پائے شہریار

سپہ سالاری اور ملکی انتظام کی صلاحیت کا معترف ہو کر اسے ذمہ دارانہ اور حاکمانہ عہدے پر مامور کیا، ہمایوں شاہ نے وصیت کی تھی کہ اس کے لڑکے نظام الدین[1] احمد سوئم (۸۶۵-۶۷ھ/۱۴۶۱-۶۲ء) کی صغر سنی میں اسکی قائم مقامی کرے گاوان نے ایک دوسرے قائم مقام ملک شاہ ترک کے ساتھ مل کر نابالغ بادشاہ کی والدہ محمودہ جہاں نرگس بیگم کی براہ راست نگرانی میں حکومت کے کام انجام دیئے، ملک شاہ ترک کی خود پسندی اور اسکے دوسرے عزائم کی وجہ سے ملکہ کے دل میں شکوک پیدا ہوئے، انجام کار اسے قتل کر دیا گیا بعد میں ملکہ خود بھی نگرانی کے فرائض سے سبکدوش ہو گئی، اس کے بعد محمود گاوان اب خواجہ جہان بن گیا۔[2]

ہم وطنوں کی تلخ یادوں کے باوجود اسے اپنے وطن سے محبت تھی، اور وہ اس سرزمین سے کسی نہ کسی طرح تعلقات قائم رکھنے کا خواہشمند تھا، لیکن جب سلطان گیلان نے اسے وطن واپس آنے کی دعوت دی تو اس نے بڑے احترام سے جواب دیا "بہمنی دور کے حکمرانوں کی عنایات سے وہ اسقدر زیر بار ہو گیا ہے کہ وہ ہندوستان چھوڑنے کی خواہش بھی نہیں کر سکتا، اسکی فرض شناسی کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے آخری دنوں تک ان کی خدمت کرتا رہے"[3]

محمود گاواں بہمنی سلطنت کا عملاً حاکم بن گیا

بہمنی سلطنت میں محمود گاواں نے قابل رشک حیثیت حاصل کر لی، وہ عملاً حاکم بن گیا، یہی چیز اس کی المناک موت کا باعث بنی۔ ریاست میں اسکی اعلیٰ حیثیت، اسکی ملکی اور فوجی اصلاحات کا اثر دوسرے امراء کے

---

[1] ریاض الانشار صفحہ ۱۰۲۔ [2] بہمنی دور کا یہ سب سے بڑا خطاب تھا،

[3] ریاض الانشار صفحہ ۱۰۳۔

وفا اور مرتبہ پر پڑا جس کے باعث اس کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے، وہ بذات خود جماعتی سیاست سے بلند تھا۔ وہ حکمران خاندان اور اپنے نئے وطن کی -- خدمت پوری وفاداری سے کرتا رہا، لیکن اس کے دشمنوں نے اسے بدنام کرنے کی مہم چلائی، محمود گاواں[۱] اس سے بے خبر نہ تھا، ایک خط میں وہ لکھتا ہے، اس کے مخالفین[۲] نے اس کے خلاف حاسدانہ[۳] مہم چلا رکھی ہے، اور وہ دشمنی میں اس قدر آگے نکل چکے ہیں کہ خود بادشاہ[۴] کے کان بھرنے لگے ہیں، لیکن وہ اپنی وفاداری اور خلوص کی وجہ سے ہمیشہ بادشاہ اور سلطنت کا وفادار رہا،

محمود گاواں کی المناک موت

محمود گاواں نے جو مرتبہ اور قوت حاصل کر لی تھی اس سے خود بادشاہ خوف زدہ تھا[۵]۔ دشمنوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، اور اس کو یہ باور کرنے پر مجبور کر دیا کہ محمود گاواں خود بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہا ہے،[۶]

ایک دن جب کہ بادشاہ نشہ میں چور تھا، دشمنوں نے اس کے سامنے اڑیسہ کے رائے کے نام گاواں کا ایک جعلی خط پیش کر دیا۔ اس خط سے ظاہر ہوتا تھا کہ گاوان نے اسے بہمنی سلطنت پر حملہ کرنے کی دعوت دی ہے، نشہ میں مخمور بادشاہ نے اسی وقت گاوان کو طلب کیا، اور کسی تحقیق کے بغیر اس کی موت کا حکم صادر کر دیا، اسطرح ۵ صفر ۸۸۶ھ مطابق ۵ اپریل ۱۴۸۱ء کو اس عظیم مدبر اور عالم[۷] کی تابناک زندگی کا

---

[۱] ریاض الانشاء ص ۲۰۸ [۲] ایضاً ص ۲۷ [۳] تصنیف سخاوی جلد دہم صفحہ ۱۴۵ برہان ماثر ص ۱۲۷ [۴] محمود گاواں کے ایک قصیدہ کے یہ اشعار ملاحظہ کریں

[۵] رخسار مہ عالم روشن چو خور بودیک   اعمی است چشم حاسدانہ دیدن دلائل

اما بہ پیش بارت جز چاکری و اخلاص   چیزے دگر نہ دارد این بندہ را وسائل

[۶] سخاوی جلد دہم ص ۱۴۵، برہان ماثر ص ۱۳۲ - ۱۲۵، تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۵۰، مراۃ سکندری ص ۱۱۵ -

خاتمہ ہو گیا۔ اس کی زندگی کا یہ المناک انجام اس کے قصیدہ کے مندرجہ ذیل اشعار کی یاد دلاتا ہے۔ یہ قصیدہ اس نے دس برس پہلے محمد شاہ کی شان میں لکھا تھا[۱]

شدہ تشکل ضرب تیغت بر دوش دل حمائل   ہیکل زحرز سیفی داگہ ہراس اے دل

تیغ تو آب حیواں مردم زحسرت آں   آرے بہ عہد من شد آب حیات قاتل

گاواں کی موت پر بادشاہ خود سوگ مناتا ہے،

گاواں کے قتل کی دل خراش خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اس کی موت پر سارے ملک میں سوگ منایا گیا۔ صاحب "الضوء اللامع" سخاوی لکھتا ہے، کہ اس نے یہ خبر مکہ میں سنی جہاں تعزیتی جلسہ کیا گیا، اور اس المناک واقعہ پر غم و ہمدردی کا اظہار کیا گیا[۲]، خود سلطان محمد شاہ کو اپنی اس غیر دانشمندانہ حرکت پر ندامت تھی، جس کی وجہ سے اسے ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا۔ مورخ فرشتہ کہتا ہے کہ بالآخر اسی صدمہ نے بادشاہ کی جان لے لی[۳]۔ گاواں کی موت سے عوام میں اس قدر ہیجان پیدا ہو گیا تھا کہ اسے سرد کرنے کے لیے بادشاہ کو ایک جھوٹا اعلان جاری کرنا پڑا جس میں عوام کے اطمینان کے لیے ان اسباب کا تفصیلی ذکر تھا، جو گاواں کی موت کا باعث بنے[۴]، یہ اعلان گاواں کی تعریف و توصیف سے بھرا ہوا ہے،

گاواں کے اخلاق و عادات

گاواں سچا مسلمان، اپنے بادشاہ کا وفادار، شائستہ مزاج اور نرم خو تھا

---

[۱] برہان ماثر صفحہ ۱۲۹۔ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۰، ریاض الانشاء صفحہ ۱۴۶-۱۵۰
یہ قصیدہ اس نے خلاق معنی کمال اسمٰعیل کے اس قصیدہ کے نمونہ پر لکھا ہے جس کے دو شعر مندرجہ ذیل ہیں

شد تشکل ضرب تیغت بر دوش دل حمائل   ہیکل زحرز سیفی داگہ ہراس اے دل

برگردنم زتیغت طوقیست پر جواہر   زیں طوق گردن جاں ہرگز عباد عاطل

[۲] سخاوی جلد دہم، صفحہ ۱۴۵ [۳] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۱، برہان ماثر صفحہ ۱۳۲

[۴] ایضاً صفحہ ۱۳۰-۱۳۲

اعلیٰ ترین مرتبہ پر پہنچنے کے باوجود اس نے سادہ اور پاکیزہ زندگی گذاری۔ طاقت یا دولت کا حصول اس کی زندگی کا مقصد نہ تھا، وہ امیر، غریب، بادشاہ، درویش سب کا یکساں دوست تھا، اس نے ایک خط میں لکھا ہے، اس کا ایمان تھا کہ "مقاصد کے حصول کا انحصار فہم و فراست پر، اعلیٰ مرتبہ کے حصول کا انحصار علم پر اور کردار کی پاکیزگی کا انحصار طرز زندگی پر ہے۔[۱]

گاواں اپنے عہد کی ممتاز شخصیت

مورخین اس کی فیض رسانی فنون لطیفہ اور ادب کی سرپرستی[۲] کے رطب اللسان ہیں، اس کی شخصیت اپنے عہد کی نمایاں شخصیت تھی، اس کے ہم عصروں پر اس کا اثر گہرا اور دیرپا تھا، اس کے اعلیٰ کردار کی وجہ سے ساری دنیا اس کی عزت کرتی تھی۔ اس کی نرم خوئی۔ خاکساری، خلوص، تقدس اور پاکیزگی نے سبھوں سے خراج تحسین وصول کیا۔

علماء سے گاواں کے تعلقات

ہمعصر علماء سے اس نے یا تو خود ملاقات کی یا خط و کتابت کے ذریعہ شناسائی پیدا کی، سخاوی لکھتا ہے کہ "محمود گاواں نے شیخ بخاری (محمد بن محمد بن محمود الشمس الحنفی) سے قاہرہ میں ملاقات کی اور ان سے کچھ ہدایات حاصل کیں۔ اس نے زین الزرکشی سے صحیح مسلم سنا۔ اس نے شام کے کچھ ایسے علماء سے ملاقات کی جو علم کی کسی نہ کسی شاخ کے ماہر تھے[۳]، اسے خواجہ خواجگان عبید اللہ[۴]، شیخ بایزید امام صدر الدین رواسی اور مولانا جامی سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کا ذکر اس نے اپنی کتاب ریاض الانشاء میں بھی کیا ہے۔ اس نے مولانا جامی کو ہندوستان آنے کی بار بار دعوت دی، جو قبول نہیں کی گئی، تا امید ہو کر اسنے

[۱] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۷۹۔ ریاض الانشاء صفحہ ۳۲۔ ۳۳ مکتوب نمبر ۵
[۲] ایضاً جلد اول صفحہ ۳۵۹ [۳] سخاوی ۱۰ ص ۱۴۲ [۴] ریاض الانشاء ص ۲۳، ۸، [۵] ایضاً،

یہ شعر کہا۔[۱]

این ہمہ فریاد و شتاقان ز استغنائے اوست لن ترانی می رسد از طور موسیٰ را جواب

کچھ ممتاز عالموں کو اس نے اپنے مدرسہ میں درس و تدریس کے لیے بیدر بلایا تھا، جلال الدین دوانی[۲]، اور ابو بکر تہرانی[۳] کو بھی اس نے دعوت دی تھی، لیکن وہ ہندوستان نہ آسکے۔

علماء بھی اس کی بڑی تعظیم کرتے تھے، جلال الدین دوانی نے شیخ شہاب الدین سہروردی کی مشہور کتاب ہیاکل النور کی شرح شواکل الحور[۴] کو اظہار تعظیم کے طور پر گاواں کے نام سے معنون کیا ہے، مولانا جامی نے اپنی کتاب شرح فصوص الحکم[۵] کی ایک کاپی اسے تحفتاً ارسال کی تھی، محمود گاواں اور مولانا جامی کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہتی تھی، ان خطوط کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے کس قدر عزت تھی[۶]، مولانا جامی نے گاواں سے اپنے تعلق کا اظہار اشعار میں بھی کیا ہے، انھوں نے ایک قصیدہ گاواں کی مدح میں لکھا ہے جس کا مطلع[۷] یہ ہے:

الصلا کہ جان و دل منزل تو کردم الصلاۃ مرحبا اے قاصد ملک معانی مرحبا

مزید وہ کہتے ہیں[۸]:

ملت سر الفقر لکن تحت استار الغنا ہم جہاں را خواجہ اہم فقر را دیباچہ او

(بقیہ حاشیہ ص ۵۰)[۹] ریاض الانشاء[۱۰] ایضاً ص ۲، ۸، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۳۰۰ اور ۳۶۵ مزید دیکھیے ص ۲۳۱ ۵

مردمی فرمائے و روشن کن سرائے چشم من مردم چشمی و بے مردم نہ دارد خانہ نور

[۱] ایضاً ص ۳۰۳، مکتوب نمبر ۱۰۲ [۲] ایضاً ص ۳، ۱۳، ۱۴۲ [۳] ایضاً ص ۶، ۵۰، ۱۱
[۴] کشف الظنون جلد چہارم ص ۵۰۵ [۵] ریاض الانشاء ص ۲۹۷ [۶] تاریخ فرشتہ ج اول ص ۳۵۰ [۷] تاریخ فرشتہ ج اول ص ۳۵۸، کلیات جامی ص ۵۳ (سال طبع ۱۹۱۳ء) [۸] کلیات جامی ص ۵، مطبوعہ نولکشور پریس سال طبع ۱۹۱۳ء "الفقر تحت استار الغنا" مورخ فرشتہ (ج اول ص ۳۵۰) نے دوسرا مصرع لکھا ہے،

اس کے علاوہ انھوں نے ایک قطعہ بھی اس کی تعریف میں کہا ہے،[1]

جامی اشعار دلآویز تو جنسے است لطیف — بود ش از حسن بود لطف معانی تارش

ہمرہ قافلہ ہند روان کن کہ رسد — شرف و عز و قبول از ملک التجارش

محمود گاواں کا علم و فضل گاواں نہ صرف ایک عظیم مدبر، بہادر سپاہی اور کامیاب حکمراں تھا، بلکہ دنیائے علم و ادب میں بھی اس کا مرتبہ قابل رشک تھا، وہ بڑا عالم بھی تھا، علم ریاضی اور طب میں اسے خاص دسترس حاصل تھی،[2] صاحب برہان ماثر اسکی دانشمندی کا معترف ہے، گاواں کے کام اور صلاحیت کی مبالغہ آمیز تعریف اسنے یوں کی ہے،

"وہ دنیا کے تمام عالموں اور دانشوروں سے افضل تھا"[3]

محمود کو نظم و نثر دونوں پر مہارت حاصل تھی، علم ریاضی اور خطوط نویسی میں اس کا جواب نہیں تھا۔[4] وہ مختلف علم و فن کے ماہروں کا مرکز نگاہ تھا، ملا الکریم ہمدانی کو اس سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ انھوں نے اس کی سوانح حیات لکھکر اسے خراج عقیدت پیش کیا ہے،[5] ملا شمس الدین اس کے ہم نشینوں میں تھے،[6] شاعر سامعی کو بھی اس کی سرپرستی حاصل تھی، ان عالموں کے علاوہ، علماء و فضلاء کی ایک جماعت اس کے زیر سایہ تھی، محمود گاواں نے اپنے ایک خط[7] میں لکھا ہے، "سلطنت دکن آسمان میں آفتاب کی طرح ہے"[8] اور ملک کا جو حصہ بہمنی سلطنت کے زیر اثر آیا وہ "خدا شناسوں کا مسکن اور علماء کی پناہ گاہ[10] بن گیا"[9] ۸۷۷ھ میں اس نے بیدر میں ایک مدرسہ کی بنا ڈالی تھی، اور اسکے تحت

---

[1] کلیات جامی ص ۔ [2] تاریخ فرشتہ ۱ ص ۳۵۰ [3] تاریخ فرشتہ ج اول ۳۵۹ [4] کلیات جامی مطبوعہ نولکشور پریس ۱۹۱۲ء ص ۲۶۴

[5] برہان ماثر ص ۱۳۲ [6] ایضاً ۱۳۲ [7] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۵۹ [8] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۵۰ [9] ریاض الانشاء ص ۱۲۱، ۱۲۰، مکتوب نمبر ۲۰ [10] ایضاً الانشاء ص ۹۶ [11] ایضاً ص ۱۶۷

ایک کتب خانہ بھی قائم کیا تھا، کتب خانہ میں کتابیں ہزاروں کی تعداد میں تھیں۔ درس و تدریس کے لئے منفرد اوصاف کے حامل معلمین کا انتظام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ فرصت کے اوقات وہ خود بھی مدرسہ میں پڑھایا کرتا تھا۔[1] اس تعلیمی ادارے نے بعد میں بڑی شہرت حاصل کی۔

ادب میں محمود گاواں کا حصہ محمود گاواں نے نہ صرف خوبصورت عمارتیں تعمیر کرائیں، تعلیمی ادارے قائم کئے، فوجی اور تمدنی نظام میں انقلاب لایا، عظیم بہمنی سلطنت کو استحکام بخشا، بلکہ اس نے ایسے ادبی شہ پارے بھی چھوڑے ہیں جو ابد تک اس کا نام زندہ رکھیں گے، یہ درج ذیل ہیں۔

(الف) مناظر الانشاء:۔ یہ کتاب خطوط نویسی اور انشاپردازی پر لکھی گئی ہے، اس میں علم فصاحت علم عروض اور علم صنائع کا خاص طور سے تذکرہ کیا گیا ہے،

(ب) ریاض الانشاء:۔ یہ اس کے ۱۴۸ خطوط کا مجموعہ ہے، اس نے اسے خود ہی ترتیب دیا ہے، خود اسکا لکھا ہوا ایک مقدمہ بھی کتاب میں شامل ہے۔

ڈاکٹر غلام یزدانی نے اسے ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد دکن سے شائع کر دیا ہے۔

(ج) دیوان:۔ اس کے قصائد اور غزلوں کا مجموعہ ہے، اس دیوان کا اب سراغ نہیں ملتا مگر معلوم ہوتا ہے کہ مورخ فرشتہ[2] نے اسے ۱۰۲۳ھ سے پہلے دیکھا تھا،

(الف) مناظر الانشاء:۔ یہ ایک مقالہ ہے اور فن انشاء پردازی پر لکھا گیا ہے،

---

[1] برہان ماثر صفحہ ۱۳۲، تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۰، آثار خیر مصنف ابوسعید احمد صفحہ ۲۶ تا ۲۷ سیرت محمود صفحہ ۶۲، ۱۱۵ اور ۱۶۶ [2] سیرت محمود صفحہ ۴، [3] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۸

یہ مقالہ ایک مقدمہ[1] دو مقامہ[2] اور ایک خاتمہ[3] پر مشتمل ہے، مقدمہ میں انشاء پردازی کی تعریف نوعیت اور موضوع پر بحث ہے،

پہلے مقامہ میں فن انشاء پردازی کے لحاظ سے کلام کے اقسام، الفاظ کے انتخاب اور اصول سے بحث ہے، دوسرا مقامہ مکتوباتی انشاء پردازی کے مختلف اسلوب اور ان سے متعلق قواعد پر مشتمل ہے، مناظر الانشاء کا اختتام علم ہجا کے باب پر ہوتا ہے،

یہ کتاب عربی کی مستند تصنیفوں کی مدد سے لکھی گئی ہے، محمود گاواں نے فارسی زبان کے مطابق مواد ڈھال لیے ہیں اور مثالیں بھی فارسی ہی کی پیش کی ہیں۔

محمود گاواں نے انشاء پردازی کی تعریف اس طرح کی ہے (یہ) "وہ فن ہے جو تراکیب منشورہ اور خطب ورسائل[4] کے حسن وقبح کو پرکھتا ہے" اس نے حسن کلام، فصاحت اور اس کے لوازم پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے، وہ صنائع وبدائع پر بحث کرتا ہے، اور بتاتا ہے کہ کب اور کس ساخت کا کلمہ یا فقرہ فصیح ہوتا ہے، اس نے اپنے نقطۂ نظر کے ثبوت میں مثالیں بھی پیش کی ہیں، مثالوں میں کبھی وہ اپنی ہی تحریر سے حوالے دیتا ہے، اور کبھی عربی اور فارسی کے بلند مقام شاعروں کے حوالے لاتا ہے۔ اس نے کتاب میں بادشاہوں کی حکایات اور لطائف وظرائف کو بھی جگہ دی ہے،

اس کتاب سے اس زمانہ کی انشاء پردازی پر روشنی پڑتی ہے۔ محمود کے قول کے مطابق انشاء پردازی کے چودہ[5] ارکان اور پندرہ شرائط ہیں[6]، جن کا عام خط لکھتے وقت بھی

---

[1] مناظر الانشاء شبلی اکیڈمی خطوطہ نمبر ۴۰ - ورق ایک اور دو الف [2] ایضاً ورق ۲ الف تا ۲۳ الف اور ۲۳ الف تا ۳۱ الف، [3] ایضاً ورق ۳۱ الف تا ۴۰ الف [4] مناظر الانشاء شبلی اکیڈمی مخطوطہ نمبر ۴۰ ورق ۱ ب [5] ایضاً ورق ۲۳ ب تا ۲۸ الف [6] ایضاً ورق ۲۸ الف تا ۲۹ ب

برتنا ضروری ہے،

ان حد بندیوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تحریر فطری باقی نہیں رہتی۔ پھر بھی یہ وہ حد بندیاں ہیں، جن کے بغیر تحریر میں دلکشی نہیں آتی، مسلمانوں نے اس فن میں اتنی مہارت حاصل کر لی تھی کہ ایک عام قاری بھی مرصع نثر کو اس کے تمام غیر فطری عناصر کے باوجود فطری ہی سمجھتا تھا، زمانہ قبل اسلام میں عربوں کا فطری رجحان مرصع اور مسجع نثر نگاری کی طرف تھا۔ اس زمانہ کے مشہور مقرروں کی تقریروں کے نمونے آج بھی محفوظ ہیں، جو مرصع اور مسجع ہیں۔ عباسیوں نے اس فن کو اور بھی پروان چڑھایا تھا، ان کے زمانہ میں اس فن میں استعداد رکھنا کامیابی اور اعلیٰ مقامی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانہ کے وزرا اور معتمد (سکریٹری) اس فن کے ماہر ہوتے تھے۔ ان میں چند ممتاز شخصیتوں کے نام یہ ہیں، الخصیبی ابن مقلہ، المہلبی، ابن العمید، صاحب بن عباد، الاسکافی۔ ان کے خطوط کے مجموعوں نے بڑی شہرت حاصل کی ہے، ان کے علاوہ ابوبکر الخوارزمی، ابن المعتز، الہمدانی اور ابن الحمید چند دوسری ممتاز شخصیتیں ہیں جو اس فن کے ماہر تھے یہ مقولہ مشہور ہے کہ اس فن کی ابتدا العمید نے کی اور اختتام ابن الحمید پر ہوا۔ "ابدات بابن العمید وختمت بابن الحمید"

ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں یہ فن اپنے عروج پر تھا، اس زمانہ میں خود اس فن پر کتابیں لکھی گئیں، ان میں سے ایک کتاب "التوسل فی صناعۃ الترسل" جامع اور مشہور کتاب ہے، نویں صدی ہجری میں القلقشندی نے "صبح الاعشیٰ فی معرفۃ الانشاء" لکھی جو چودہ (۱۴) جلدوں پر مشتمل ہے، اسی کتاب کو اس فن کا انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے۔

اسی زمانہ[1] میں محمود گاواں (۸۱۳ھ تا ۸۸۶ھ) نے ہندوستان میں

خطوط نویسی کی طرف توجہ دی اور اپنے خطوط کا مجموعہ "ریاض الانشاء" شائع کیا جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ اس نے مناظر الانشاء میں اس فن کے اصول و قواعد منضبط کیے جو ہندستان کے فارسی ادب کا قابل قدر حصہ ہے۔ یہ کتاب اگرچہ "ریاض الانشاء" کے بعد لکھی گئی ہے، مگر اس مقالہ میں اس پر ریاض الانشاء سے پہلے بحث کی گئی، کیونکہ خود مصنف نے اسے ریاض الانشاء کا مقدمہ کہا ہے۔ اس نے لکھا ہے[1] کہ اگر زندگی نے مہلت دی تو وہ ریاض الانشاء کے مقدمہ کی شکل میں فن انشاء پردازی پر ایک کتاب لکھے گا، اور اس میں ان نکتوں سے بھی بحث کرے گا جن کا تعارف بنا پہلے بھی کرا چکے ہیں، اور وہ کتاب علم و فن کی نئی راہیں نکالے گی۔

(ب) ریاض الانشاء[2] یہ محمود گاواں کے خطوط کا مجموعہ ہے، اس میں اس کے ذاتی خطوط کے علاوہ چند وہ خطوط بھی شامل ہیں جو اس نے بہمنی سلطنت کی طرف سے لکھے تھے، یہ کتاب اس نے خود ترتیب دی ہے۔ مورخ فرشتہ نے اس کا نام روضۃ الانشاء لکھا ہے، جو غلط ہے[3]۔ ریاض الانشاء ڈاکٹر غلام یزدانی حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۸ء میں شائع کر چکے ہیں، اس میں شیخ چاند بن حسین بی۔ لٹ (آکسن) کی تصحیح اور حواشی شامل ہیں اس کتاب میں ایک سو اڑتالیس[۱۴۸] خطوط ہیں، اور خود مصنف کا لکھا ہوا مقدمہ ہے، مقدمہ میں مصنف نے لکھا ہے "اگرچہ یہ خطوط منتشر خیالات اور ریاستی انتظامات کی پریشانیوں کے درمیاں لکھے گئے ہیں پھر بھی ان کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ اور دوستوں کی فرمائشوں سے

[1] ریاض الانشاء صفحہ ۴۔ [2] ایضاً مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۴۸ء اور کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ مخطوطہ نمبر ۳ ورق ایک تا ۱۰۔

[3] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۰۔

مجبور ہو کر کچھ ایسے خطوط جن کے مسودے محفوظ تھے، اکٹھا کر دیے گئے ہیں[1]

مناظر الانشاء[2] سے پتہ چلتا ہے، کہ محمود گاواں کو فن خطوط نویسی کی نہ صرف پوری پوری واقفیت تھی، بلکہ اس پر اسے مہارت حاصل تھی، وہ بڑا ذہین اور بلند خیال تھا، وہ حافظ قرآن بھی تھا، رسول اللہؐ کی حدیثیں، منتخب اشعار، اور ضرب الامثال کا استعمال بھی برمحل اور برجستہ کرتا تھا، اس نے ممتاز شاعروں کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اسے الفاظ کے صحیح استعمال کا پورا پورا علم تھا۔

محمود گاواں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے جچے تلے اور برمحل الفاظ کا استعمال کرتا تھا وہ بعض اوقات مقفیٰ عبارت بھی لکھ جاتا تھا، وہ عربی کے ادق الفاظ بھی استعمال کرتا تھا، جس سے کبھی کبھی عبارت گنجلک ہو جاتی تھی[3]، اس زمانہ کا یہی اسلوب تھا، محمود گاواں کا یہ بھی کمال ہے کہ عربی الفاظ کی کثرت استعمال کے باوجود وہ فارسی اسلوب نگارش[4] کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، اس کی مقفیٰ نثروں میں بھی مشکل الفاظ ملتے ہیں، تشبیہوں، استعاروں اور حوالوں کی کثرت استعمال کی وجہ سے اکثر اس کی تحریر غیر دلچسپ ہو جاتی ہے، اس کی تحریریں شوکت الفاظ کے لحاظ سے نمایاں طور پر قابل ذکر ہیں، محمود گاواں کو اپنی انشا پردازی کی قدر و قیمت کا علم تھا، وہ ریاض الانشاء کے مقدمہ میں دعویٰ کرتا ہے اس کی تحریریں مقبول عام تھیں[5]، وہ کہتا ہے کہ اس کے مضامین اس کی ذہنی کاوش اور ادبی

[1] ریاض الانشاء صفحہ ۱۱ تا ۱۲۔ بنابریں مکتوبے چند کہ مسودۂ آں از عروض حوادث مجردہ زمان محفوظ ماندہ بود مظنہ آں می شد کہ بعین رضائے اہل دانش ملحوظ گردد در سلک تالیف انتظام دادہ و آں کتاب ریاض الانشاء نام نہادہ۔ [2] مناظر الانشاء ورق ۲۲ب تا ۳۰ الف۔ [3] ریاض الانشاء

[4] دیکھیے خصوصاً مکتوبات نمبر ۹ تا ۱۰، ص ۲۰۸، ۲۰۹ تا ۲۰۹ [5] ایضاً ص ۱۱

رجحان کا نتیجہ ہیں، اس نے کسی دوسرے کے علم سے استفادہ نہیں کیا، بقول خود وہ علم و فضل میں ابن العمید اور صاحب بن عباد سے اور انشا پردازی میں ابن الفرات سے کسی طرح کم نہیں[۵۱]،

چندیں وزیر کامل بودند نزد شاہاں | لیکن وجود فضلم بر جملہ ہست فاضل

ابن الفرات طبعم در معرض عبارات | ز ابن العمید و صاحب کم نیست در فضائل

مولانا جامی نے بحیثیت مصنف اس کی عظمت کا اس طرح اعتراف کیا ہے[۵۳]:

فقرہ ہاے نثر او نوبت دہ پشت ہنر

اس[۵۴] کا ہر خط ایک تمہید سے شروع ہوتا ہے، اس کی تمہید میں قرآن اور حدیث کے جواہر پاروں اور علم مابعد الطبیعیات یا فلسفہ، نجوم، تواریخ، جغرافیہ، علم تمدن اور شاعری کے حوالوں سے بھری پڑی ہیں، اس کے خطوط تاریخی معلومات کے قابل قدر ذریعہ ہیں، اُن سے اس کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی بہمنی حکومت کا ہندوستان کی دوسری ریاستوں اور بیرون ہند کی حکومتوں کے ساتھ تعلقات کیسے تھے، اس کے خطوط سے اس کی ایمانداری، پاکبازی، علم دوستی، عالموں اور درویشوں سے محبت، نسبی تفاخر، بادشاہوں کے ساتھ قرابت داری، میدان جنگ میں ثابت قدمی، اولو العزمی اور عزیز و اقربا سے محبت کا سراغ ملتا ہے، اس مجموعہ میں مندرجہ ذیل وزیروں اور بادشاہوں کے نام لکھے گئے خطوط شامل ہیں،

۵۱ ریاض الانشا ص ۱۲ تا ۱۳ ۵۲ ایضاً ص ۴۶، سلطان محمود شاہ کی مدح میں لکھے گئے قصیدہ کا شعر نمبر ۴۶ اور ۴۷ (ص ۱۴۳ تا ۱۵۰)

۵۳ ریاض الانشا ص ۵۴

۵۴ مکتوب نمبر ۱۳ (صفحہ ۷۰ تا ۷۷) بنام شاہ مصر عربی میں ہے،

(۱) شرف الملک وزیر مالوہ صدر بن کبیر (۲) صدر الدین شرف جہاں (۳) امیر جان بن شاہ اللاری (۴) وزیر سلطان روم محمود شاہ رومی (۵) سلطان روم سلطان محمد (۶) گیلان کے سلطان علاء الدین (۷) گیلان کے سلطان محمد بن سلطان ناصر (۸) گرگان کے سلطان ابو سعید (۹) عراق کے سلطان حسین بیگ (۱۰) جونپور کے سلطان حسین شاہ (۱۱) گجرات کے سلطان محمود (۱۲) مالوہ کے سلطان محمود خلجی،

خطوط میں علما کے مندرجہ ذیل نام ملتے ہیں،

(۱) مولانا شرف الدین علی یزدی (۲) شمس الدین محمد لاری، (۳) مولانا ابو سعید (۴) صدر جہاں قاضی شرف الدین، (۵) مولانا عبد الرحمن جامی، (۶) مولانا ابوبکر تہرانی (۷) شیخ محمود مندلوی (۸) مولانا کمال الدین رومی (۹) مولانا اسمٰعیل (۱۰) علامہ نور الدین عبد اللہ،

کچھ خطوط مندرجہ ذیل درویشوں کے نام بھی ہیں،

(۱) خواجہ عبید اللہ (۲) مولانا نعمت اللہ (۳) شیخ صدر الدین الرواسی

مولانا عبد الرحمن جامی کے نام لکھے گئے ہیں، خطوط بہت دلچسپ ہیں، ان خطوط سے اس نے مولانا کو ہندوستان آنے کی رغبت دلائی ہے، اور ان کے پاس تحفے بھیجے ہیں،

(باقی)

تلخیص و تبصرہ

اصحابِ کہف

از

مولوی محمد عمیر الصدیق صاحب ندوی

اصحابِ کہف کا واقعہ اپنے ابہام و اجمال کی وجہ سے مفسرین کے لئے ہمیشہ سے تحقیق و تشریح کا موضوع رہا ہے، اصحابِ کہف کون تھے؟ ان کا واقعہ کب اور کیسے پیش آیا؟ اور اس کہف (غار) کی جائے وقوع کہاں ہے؟ اس سلسلہ میں مفسرین نے مختلف روایتیں نقل کی ہیں، اسرائیلیات سے قطع نظر بعض اہلِ تفسیر نے تاریخ اور قیاس کی مدد سے بھی اس عقدہ کی گرہ کشائی کی کوشش کی ہے، صاحبِ روح المعانی نے محلِ وقوع کی نشاندہی کی بھی کچھ سعی کی ہے لیکن پھر بھی بات واضح نہیں ہو سکی ہے، بعض یورپین مورخین نے ایک سریانی ماخذ کا بھی ذکر کیا ہے اور زمانہ حال کے بعض مفسرین نے پرانی تفسیری روایت سے اس کی مشابہت ثابت کی ہے، مگر وہ سریانی ماخذ خود محلِ نظر ہے،

اردو میں مولانا ابو الکلام آزاد نے سورۂ کہف کی تفسیر میں اس پہلو پر بھی توجہ کی ہے، ان کی رائے یہ ہے کہ رقیم اصحابِ کہف کی وہ بستی ہے جو ایلہ (عقبہ) اور فلسطین کے درمیان واقع ہے اور جو بعد کو پٹیرا (بطرا) کے نام سے مشہور ہوئی، پہلی جنگِ عظیم کے بعد آثارِ قدیمہ کے سلسلہ میں جو تحقیقات ہوئیں، ان کی روشنی میں انھوں نے یہ رائے قائم کی تھی کہ اگر

جزیرہ نمائے سینا اور خلیجِ عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف بڑھیں تو دو پہاڑی سلسلے متوازی شروع ہو جاتے ہیں، اور سطحِ زمین بلندی کی طرف اٹھنے لگتی ہے، یہ علاقہ کبھی نبطی قبائل کے زیرِ اقتدار تھا اسی علاقہ کی ایک پہاڑی سطح پر رقیم شہر آباد تھا دوسری صدی عیسوی میں جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کر لیا، تو رقیم کی حیثیت بھی ایک رومی آبادی کی ہو گئی، اسی زمانہ کے جب پیٹرا کے نام سے اس کے عظیم الشان معبدوں اور تھیٹروں کی شہرت دور دور تک پہنچی [illegible] میں جب مسلمانوں نے اس علاقہ کو فتح کیا تو رقیم کا نام زبانوں پر کم اور بطرا کا نام زیادہ مشہور تھا، جنگِ عظیم کے بعد از سر نو اثری پیمائش سے نئی نئی باتیں روشنی میں آرہی ہیں، از انجملہ اس علاقہ کے عجیب و غریب غار ہیں جو دور تک چلے گئے ہیں، اور نہایت وسیع ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ دن کی روشنی کسی طرح ان کے اندر نہیں پہنچ سکتی،

اس انکشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اصحابِ کہف کا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا، اور قرآن نے صاف صاف اس کا نام الرقیم بتا دیا ہے، اور جب اس نام کا ایک شہر موجود تھا، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ رقیم کے معنی میں تکلفات کئے جائیں، اس کے علاوہ مولانا نے دوسرے قرائن بھی اپنے دعوی کے اثبات میں پیش کئے ہیں، ترجمان القرآن کی اشاعت کو چالیس برس سے زیادہ ہو گئے ہیں، اس اثنا میں تحقیق کا قدم آگے بڑھتا رہا، نومبر [illegible] کے رسالہ العربی نے لکھا ہے کہ اردن کے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے چند برس پیشتر عمان سے سات کیلو میٹر جنوب میں رکیب نامی ایک گاؤں میں تحقیقات کا آغاز کیا، رکیب، رقیم کی ہم آہنگی خود ظاہر کرتی ہے کہ یہ آج کا رکیب قدیم رقیم ہو سکتا ہے، رابطۃ العلوم الاسلامیہ کے صدر استاذ نبہان کے مطابق ۱۹۶۲ء میں بطرا کے علاقہ میں ایک غار کا پتہ چلا، فوراً ایک ٹیم وہاں پہنچی، اور ایک طویل تلاش و جستجو کے بعد مندرجہ ذیل حقائق کا انکشاف ہوا،

۱۔ غار کے اندر بازنطینی زمانہ کے نقوش، زیورات، اور سکّے ملے ، یہ بازنطینی عہد تیسری صدی عیسوی کا ہے، جو بازنطینی زمانۂ سلطنت ہے، ان سکوں سے (جو چاندی کے ہیں) قرآن مجید کی آیت فابعثوا احدکم بورقکم ھذہٖ الی المدینۃ (اچھا ایک آدمی کو (چاندی کا) سکہ دیکر شہر بھیجو) کا مفہوم بخوبی واضح ہوجاتا ہے۔

۲۔ غار میں ، قبریں اور کتے کی بھی قبر ملی ، (و یقولون سبعۃ و ثامنھم کلبھم لوگ کہتے ہیں کہ سات تھے ، اور اٹھواں ان کا کتا تھا،

۳۔ قبروں کی موجودگی کے علاوہ سات انسانی سر ملے ، اور ان کے ساتھ ایک ایسا سر بھی ہے جو کتے کا معلوم ہوتا ہے ،

۴۔ قریب ہی ایک معبد بھی موجود ہے، خیال ہے کہ یہ وہی معبد ہے اجسے قرآن مجید نے مسجد کے نام سے تعبیر کیا ہے، قال الذین غلبوا علیٰ امرھم لنتخذن علیھم مسجدًا (جو لوگ ان کے معاملات پر غالب آگئے انھوں نے کہا ہم ضرور ان پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے) اس معبد کے آثار میں چند ستون ہیں، جو بالکل صحیح حالت میں موجود ہیں،

استاذ ذطبیان نے یہ بھی تبلایا کہ پتھروں اور مٹی کے ہٹائے جانے اور صاف کرنے کے بعد ایک سوراخ دار پتھر کا بڑا سا ڈھکن نظر آیا، اسے ہٹانے کے بعد غار کا اندرونی حصہ صاف طور سے سامنے آگیا، یہ تقریباً ۳ × ۴ میٹر کشادہ جگہ تھی، یہاں قرآن حکیم کی حقانیت پھر واضح ہو کر رہی جس نے صدیوں پہلے وھم فی فجوۃ منہ" (اور وہ غار کے اندر ایک کشادہ جگہ میں ہیں) کہکر خبر دی تھی ،

استاذ ذطبیان کے قول کے مطابق قرآن کی بیان کردہ تمام صفات اس جگہ منطبق ہوتی نظر آتی ہیں. آج بھی وہاں آفتاب طلوع کے وقت غار سے اس طرح گزرتا ہے کہ

دھوپ غار کے اندر نہیں پہونچتی ، غروب کے وقت بھی اس کی شعاعیں غار کے اندر نہیں جاپاتیں اس طرح قرآن کی یہ صداقت بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے واذا طلعت تزاور عن کھفھم ذات الیمین و اذا غربت تقرضھم ذات الشمال ، (سورج) جب نکلتا ہے تو اُن کے داہنے جانب سے ہٹا رہتا ہے ، اور جب ڈوبتا ہے تو بائیں طرف کترا کر نکل جاتا ہے ،

یہ انکشاف عقلی اور تاریخی بیانات کے اعتبار سے قابلِ قبول ہوسکتا ہے لیکن ابھی اسے حرفِ آخر نہ سمجھنا چاہیے ، آثار قدیمہ کی مزید تحقیقات سے ممکن ہے کچھ گوشے اور واضح ہوں،

شاہ عزالدین پھلواروی ندوی

شاہ عزالدین پھلواروی علمی اور دینی حلقوں کے لئے محتاجِ تعارف نہیں، اپنے مواعظ اور تصانیف کی وجہ سے خاصے معروف ہیں، ابھی چند ہی مہینہ کی تو بات ہے جب انھیں عربی زبان اور اسلامی علوم میں مہارت کی بنا پر حکومتِ ہند نے اعزاز عطا کیا تھا، اور معارف نے اس سلسلہ میں انھیں مبارکباد دی تھی، کسے معلوم تھا کہ وہ اتنی جلد اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے،

ادھر کچھ عرصہ سے ان کی صحت مضمحل رہنے لگی تھی، اس لیے انھوں نے سفر ترک کر دیئے تھے لیکن پورنیہ کے کچھ لوگ اُن کے بیحد معتقد تھے ان کی آرزو تھی کہ وہ اپنی تشریف آوری سے انھیں عزت بخشیں، اور انھیں اپنے مواعظ سے مستفید فرمائیں، شاہ صاحب نے ناسازیِ مزاج کا عذر کیا، مگر جب معتقدین کا اصرار جاری رہا تو آمادہ ہو گئے تاکہ ان کے دلوں کو ٹھیس نہ پہونچے، مومن کے دل کو خوش کرنا بڑے ثواب کا باعث ہے، انھیں اس سلسلہ میں آقائے دو جہاں کی ہدایات یاد تھیں اس لئے اپنی تکلیف کو نظر انداز کر کے آمادۂ سفر ہو گئے، راستہ بخیر گذرا، پورنیہ پہونچ کر بھی ایک آدھ دن طبیعت ٹھیک رہی لیکن پھر ضعف کیساتھ درد سینہ کی شکایت محسوس ہوئی جو برابر بڑھتی رہی، جب مقامی دوا دارو سے طبیعت قابو میں نہ آئی تو لوگ کسی بڑے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے شہر گئے، مگر ساری تگ و دو بیکار ثابت ہوئی اور

بالآخر وطن سے دوری اور عزیزوں سے مجبوری کے عالم میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی، نعش پھلواری لائی گئی، اور خاندانی قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے، وہ مجھ سے عمر میں چند سال بڑے تھے تعلیم میں بھی دو تین درجے آگے تھے لیکن طلبائے ندوہ کی انجمن الاصلاح میں میرا ان کا عرصہ تک ساتھ رہا، اور ایک سال ان کے دور نظامت میں اُن کی نیابت کا موقع بھی ملا، اس طرح عمر اور درجہ کے فرق کے باوجود اکثر نشست و برخاست اور تبادلۂ خیالات میں ساتھ رہتا، وہ مزاج کے نرم تھے، اور انھیں دوستوں کے ساتھ نباہ کرنے کا اچھا سلیقہ تھا، زود حس بہت تھے، اس لئے بعض اوقات معمولی بات بھی گرانیِ طبع کا باعث ہو جاتی، مگر حتی الامکان ظاہری برتاؤ میں فرق نہ آنے دیتے، مزاج میں رواداری اور دوست نوازی بہت تھی، طالب علمی کے بعد جب انھیں تعلیم و تدریس کی خدمت سپرد ہوئی، تو اس زمانہ میں کئی برس میرا ان کا ساتھ رہا، مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی شکر رنجی کی نوبت آئی ہو، میرے ان کے خیالات میں خاصہ فرق تھا، بسا اوقات اختلافی مسائل زیر بحث بھی آجاتے لیکن یاد نہیں پڑتا کہ کبھی تکدر یا ملال خاطر کی نوبت آئی ہو،

وہ پھلواری کے اس مشہور دینی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے جس کا سلسلہ مخدوم شاہ مجیب اللہ سے ملتا ہے، آخری زمانہ میں اس سلسلہ کے دو نامور بزرگ حضرت شاہ بدرالدین، اور مولانا شاہ سلیمان بہت مشہور ہوئے ہیں، شاہ بدرالدین بہار کے پہلے امیر شریعت تھے، جن کے اثر سے امارت شرعیہ کو استحکام حاصل ہوا، شاہ سلیمان اپنی جادو بیانی کے لئے سارے ملک میں مشہور تھے، اُن کے مواعظ عوام و خواص دونوں میں مقبول تھے، شاہ عزالدین ان دونوں سلسلوں سے تعلق رکھتے تھے، وہ شاہ سلیمان کے نواسے اور شاہ بدرالدین کے صاحبزادے شاہ محی الدین امیر شریعت دوم کے داماد تھے،

ان دونوں بزرگوں سے انھوں نے اکتساب فیض کیا، اور دونوں سے اجازت حاصل کی، سلسلہ کے اذکار و اشغال سے عملی واقفیت کے علاوہ تصوف میں ان کی علمی نظر بھی بہت گہری تھی، وہ اس کی تاریخ، اکابر صوفیہ کے حالات، اصحاب سلاسل کے واقعات، اور اُن کے معمولات و مختارات سے بخوبی آگاہ تھے، ان مسائل پر جب اُن سے گفتگو ہوئی تو انھیں بہت باخبر پایا،

یوں تو سب ہی سلسلوں سے ان کا تعلق تھا، مگر نسبتِ قادریہ کا غلبہ تھا، خاندانی اعراس و مراسم میں شریک ہوتے تھے، اس بارہ میں ان کا ایک خاص ذوق تھا، لیکن سکر پر صحو ہمیشہ غالب رہا، محفل سماع میں شرکت اور وجد و حال کی کیفیت کے باوجود صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے،

میں کبھی کبھی اُن کے اس وجد و حال پر کچھ کہتا تو مسکرا کر کہتے، ؎

ع : ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

انھیں طالب علمی ہی کے زمانہ سے عربی ادب کا خاص ذوق تھا، اور بے تکلفی سے عربی بولتے اور لکھتے تھے، اُن کے عربی مضامین شائع بھی ہوتے تھے، یاد آتا ہے کہ ۲۵ء یا ۲۶ء میں اُن کا ایک تحقیقی مضمون مصر کے مشہور رسالہ "الزہراء" میں شائع ہوا تھا، ندوہ میں عربی ادب کی اہم کتابیں پڑھاتے تھے، لیکن اس کے ساتھ دینی علوم سے بھی تعلق تھا، اور حدیث و تفسیر کے کچھ اسباق بھی پڑھاتے تھے، اسی ذوق نے اُن سے حدیث کی تاریخ، اور حیات امام احمد بن حنبلؒ لکھوائی، کچھ اور کتابیں بھی انھوں نے لکھیں جن میں سے بعض چھپ گئی ہیں، اور بعض کے مسودے اُن کے ہاں موجود ہوں گے، ندوہ میں کئی برس تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد پھر وہ مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ کے استاد مقرر ہوئے، اس کے علاوہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں تحقیقی

کام بھی کیا، ندوہ سے جانے کے بعد کئی بار لکھنؤ، دہلی، اور اعظم گڈھ میں اُن سے ملاقات ہوئی، جب ملتے تو طالب علمی اور ندوہ کی مدرسی کے زمانہ کی بے تکلف صحبتیں یاد آجاتیں، کبھی کبھار پرخلوص خط بھی لکھتے، گذشتہ سال جب حکومت ہند کے ایوارڈ پر میں نے انھیں مبارکباد کا خط بھیجا، اور پھر معارف میں ایک نوٹ لکھا تو بہت خوش ہوئے، لکھا تھا کہ اعظم گڈھ آنے کا ارادہ ہے لیکن اجل نے اس کا موقع نہ دیا، اللہ سے دعا ہے کہ وہ اُن کے اعمالِ صالحہ کو قبول فرمائے، اور اپنی رحمت سے انھیں شاد فرمائے، خدا ان کی اہلیہ، صاحبزادیوں اور اعزہ و احباب کو صبر عطا فرمائے، اور توفیق دے کہ وہ اُن کے نیک کام کو نہ صرف باقی رکھیں، بلکہ انھیں اور چار چاند لگائیں۔ (ع ۔ ق)

مولانا مفتی محمد عتیق فرنگی محلی

مولانا مفتی محمد عتیق کا سانحۂ وفات بھی مذہبی اور علمی حلقوں کے لئے باعثِ رنج و افسوس ہے، ہرچند کہ وہ عمرِ طبعی کو پہنچ چکے تھے، اور عرصہ سے بیمار رہتے تھے، لیکن اس قحط الرجال کے زمانہ میں ان کا دم بسا غنیمت تھا، وہ فرنگی محل کے اُس خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے، جس نے کئی سو برس سے تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف اور ارشاد و ہدایت کی شمع روشن رکھی ہے، اس خاندان کے فیوض و برکات سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک بھی مستفید ہوتے رہے ہیں، مُلّا نظام الدین کا مجوزہ نصاب تعلیم ایسا مقبول ہوا کہ سینکڑوں برس سے عربی مدارس میں رائج ہے، اور درس نظامی کی تکمیل دستار فضیلت کے حصول کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے، اس دو ڈھائی سو برس میں ساری دنیا میں انقلاب برپا ہو گیا، اور تعلیمی نصاب میں غیر معمولی ردوبدل ہوا، لیکن ہندوستان میں عربی مدارس کی بڑی تعداد

اب بھی درس نظامی پڑھی ہوئی ہے، یہ ملا نظام الدین اور اُن کے جانشینوں کے خلوص اور کمال علم وعمل کا اثر ہے کہ عوام وخواص سب اس خاندان کی حلقہ بگوشی کو باعث فخر سمجھتے رہے، ملا بحر العلوم نے جب جنوبی ہند کا رُخ کیا تو نواب ارکاٹ استقبال کے لئے آگے بڑھے، اور اُن کی پالکی کو کاندھا دیا،

مولانا محمد عتیق صاحب اسی خاندان عالی کے ایک ممتاز فرد تھے، اس خاندان میں علم وعمل کا ایسا اجتماع رہا کہ فرنگی محل دار العلم والعمل کہلایا، ملا نظام الدین علمی کمال کے ساتھ شاہ عبد الرزاق بانسوی سے ارادت رکھتے تھے اسطرح اس خاندان میں علم و معرفت معقول و منقول، اور فقر و درویشی کا ہمیشہ اجتماع رہا۔ مغربی علوم و فنون کی چمک دمک سے بھی متاثر ہوئے، زمانہ کے حالات اور معاشی ضروریات نے بہتوں کو جدید یونیورسٹیوں میں پہنچا دیا۔ فرنگی محل بھی اس سے محفوظ نہیں رہا۔ اور یہاں کے بھی بہت سے افراد کالجوں اور یونیورسٹیوں کی زینت بن گئے، لیکن اب بھی پرانے بزرگوں کے کچھ نام لیوا موجود ہیں، ان ثابت قدم اصحاب میں مولانا محمد عتیق صاحب خاص طور سے قابل ذکر ہیں، انھوں نے بزرگوں کے نام کو حرز جاں بنائے رکھا، ان کے نقش قدم کو دلیل راہ سمجھتے رہے، اور باد مخالف کے تیز جھونکوں میں تعلیم و ارشاد کی اس شمع کو روشن رکھنے کی کوشش کی جو بزرگوں نے جلائی تھی، اور اللہ کا نام لے کر ساری زندگی اسی راہ میں بسر کر دی، وہ پرانے بزرگوں کی آخری نشانی تھے، ان کو دیکھ کر اور ان سے مل کر فرنگی محل کی پرانی محفلیں یاد آجاتی تھیں، اگرچہ پیرانہ سالی کی بنا پر عرصہ سے گوشہ نشین تھے، مگر پھر بھی اُن کے ساتھ لوگوں کی محبت و عقیدت کا یہ عالم تھا کہ شرعی معاملات میں سارے اودھ کو اُن کے فتوی کا انتظار رہتا تھا، اور جب تک ان کی طرف

سے اعلان نہ ہو جاتا لوگوں کو اطمینان نہ ہوتا، اسی اعتماد و اعتقاد کا اثر تھا کہ جب اُن کی وفات کا اعلان ہوا تو لکھنؤ میں اور دکانیں بند ہو گئیں، اور لوگ اپنا کاروبار چھوڑ کر نماز جنازہ میں شرکت کے لئے دوڑ پڑے، مستند اخبار نویسوں کا اندازہ ہے کہ جنازہ کے ساتھ تقریباً دو لاکھ اشخاص تھے،

حکومت نے بھی انکے اسی ہمہ گیر اثر کا اعتراف کیا، اور گورنر کی طرف سے تربت پر پھول چڑھائے گئے، لکھنؤ سے باہر کے علمی اور دینی حلقوں نے تعزیتی جلسے کئے، اور قرآن خوانی کے ذریعہ اُن کی روح کو ثواب پہنچایا، اللہ تعالیٰ مرحوم کی علمی و دینی خدمات قبول فرمائے، انھیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے، ان کے مراتب بلند فرمائے، ان کے صاحبزدگان اور متعلقین کو صبر عطا فرمائے، اور اُن کے اعمال طیبہ کو نصب العین بنانے کی توفیق نصیب فرمائے،

(ع-ق)

آہ پروفیسر اختر اورینوی

گذشتہ اپریل میں بہار کے پروفیسر ڈاکٹر اختر اورینوی کی وفات کی خبر بہت دکھ اور غم کے ساتھ سُنی، ہم دونوں ہم درس اور ہم جماعت تو نہیں رہے لیکن ہماری طالب علمی کا زمانہ ایک ہی تھا، وہ شروع میں سائنس کے طالب علم تھے، آئی ایس سی کرکے پٹنہ میڈیکل کالج میں داخل ہوئے، مگر وہاں ان کی صحت خراب ہوئی تو آگے اور رانچی کے سینی ٹوریم میں رہ کر صحت یاب ہوئے، میڈیکل کالج چھوڑ کر پٹنہ کالج میں آرٹس کی تعلیم حاصل کرنے لگے، ہم دونوں ۳۶ء میں ایم اے اردو کے امتحان میں ساتھ شریک تھے، اس کے نتیجہ میں ان کا نام سر فہرست تھا، میرا نام اُن کے بعد تھا، وہ ایم اے کرنے کے بعد پٹنہ کالج میں اردو کے لکچرار ہوئے، اس زمانہ میں ڈاکٹر سید محمود مرحوم بہار کے وزیر تعلیم تھے

وہ کالج میں اردو کے ایک لائق استاد کے تقرر کے خواہش مند تھے، اسلئے انھوں نے امیدواروں کا انٹرویو خود لیا، درجہ میں باضابطہ سبق پڑھانے کو بھی کہا اختر اورینوی صاحب اُن کے معیار پر پورے اُترے، وہ ایک استاد کی حیثیت سے طلبہ میں بہت مقبول رہے، جو نہ صرف اُن کی صلاحیت اور قابلیت، بلکہ ان کے ذاتی اوصاف کی بھی قدر کرتے، آخر میں وہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر اور پروفیسر ہوگئے تھے، انھوں نے اردو زبان و ادب کے ارتقا پر ایک مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی، بہار کے جن شاعروں، مصنفوں اور نقادوں پر اس وقت تک سیر حاصل بحث نہیں ہوئی ہے، اس کی تلافی ان کے مقالہ سے ہوگئی، اور وہ بھی ایک اچھے مصنف کی صف میں داخل ہوگئے، اس کے بعد سے جب ان کا کوئی مقالہ کہیں شائع ہوتا، تو اردو کے ادبی حلقہ میں شوق سے پڑھا جاتا، انھوں نے اپنے مقالات کے مجموعے تنقید جدید، قدر و نظر اور تحقیق و تنقید کے نام سے شائع کئے، اس طرح اردو کے اچھے نقاد بھی شمار کئے جانے لگے،

وہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے، ان کی بیوی شکیلہ اختر نے بھی اُن کے ساتھ افسانے لکھنے شروع کئے، دونوں نے رومانی دنیا کے دلوں کی دھڑکنوں کی اچھی عکاسی کی، انھوں نے کچھ ڈرامے اور ناولٹ بھی لکھے، وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے، ان کی بعض نظمیں مثلاً جگنو، ایک مجاہد فلسطین کے افکار، ارمغان شباب اور نغمے مقبول ہیں،

بہار میں اس وقت ایک اچھا علمی و ادبی ماحول پیدا ہوگیا ہے جمیل مظہری صاحب شاعر کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے، جناب قاضی عبدالودود صاحب نے اپنی علمی تحقیق و تدقیق سے بڑی ناموری حاصل کی، پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنی تحریروں سے اردو کی ادبی دنیا میں بڑی ہلچل پیدا کر دی ہے، پروفیسر حسن عسکری نے تاریخ دانی میں

اپنا لوہا منوا لیا ہے، پروفیسر سید حسن نے اپنی سنجیدہ مقالہ نگاری سے علمی حلقہ کو اپنی طرف مائل کر لیا ہے، پروفیسر عطا کاکوی اپنے ذوق شعر و ادب کی وجہ سے مقبول ہیں، کلیم عاجز صاحب کی شاعری بھی مقبول ہو رہی ہے، اسی بزم کے ایک ممتاز رکن پروفیسر اختر اورینوی بھی تھے، پٹنہ میں رہ کر ہندوستان کے ممتاز شاعروں اور ادیبوں کو اپنی طرف کھینچتے رہے، جعفر علی خاں اثر، جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری، حفیظ جالندھری اور ڈاکٹر عبادت بریلوی وغیرہ ان کے مہمان رہے، طبیعت میں سادگی تھی، ان کو اپنے مہمانوں کو مٹی کے برتنوں میں زمین پر چٹائی بچھا کر کھانا کھلانے میں کوئی عذر نہ ہوتا، مگر ان کی بیوی مہمانوں کی خاطر تواضع پوری شان سے کرنا پسند کرتیں، اختر صاحب ان سے یہ کہکر اختلاف کرتے، "میں کوئی نواب کا ناتی تھوڑے ہی ہوں جو اپنی شان دکھاؤں، بس میں جیسا ہوں ویسا ہی رہوں گا"

ان کی زندگی کے کچھ واقعات یاد رکھنے کے لائق ہیں، ایک غریب لڑکی کی تجہیز و تکفین کا سامان نہ تھا، تو انھوں نے اپنی بیوی کے سونے کے کڑے بیچ کر یہ سامان کر دیا، اسی طرح ان کے ایک عزیز دوست کو اپنے والد کے ایک مقدمے کی فیس جمع کرنے کو کچھ روپے کی ضرورت تھی، اس کا ذکر ان سے اس وقت آیا جب ان کی جیب خالی تھی، اُن کو اپنے امتحانات میں سونے کے جتنے تمغے ملے تھے، ان کو اونے پونے فروخت کر کے روپے اپنے دوست کے حوالے کر دئے،

وہ وہاں جا چکے جہاں سب کو جانا ہے، مگر بہار کے علمی و ادبی حلقہ میں ایک قابل قدر مصنف، نقاد، شاعر، افسانہ نگار، اور ایک اچھے انسان کی حیثیت سے برابر یاد کئے جائینگے،

وہ بہار کے ضلع مونگیر کے ایک گاؤں اورین کے رہنے والے تھے، ان کا خوشحال خاندان

جاجنیری زیدی سادات سے تھا جو مرزا غلام احمد کا پیرو ہوگیا، اس حیثیت سے وہ احمدی تھے، اپنے مسلک کی تبلیغ بڑی سرگرمی سے کرتے رہتے، پاکستان میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تو ان کے قریبی دوستوں کا بیان ہے کہ ان کو بڑا دکھ ہوا، ان کی افسانہ نگار بیوی نے ان کی زندگی میں لکھا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے کوسوں دور رہتے، سمجھ میں نہ آنے اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنے والے شوہر ہیں، مگر اسی کے ساتھ اس کا بھی اعتراف کیا تھا، کہ جب اُن کے ساتھ گھر کے سارے لوگ ایک ہی ساتھ کھانا کھایا کرتے، تو ایسی مزیدار باتوں کا سلسلہ چلتا کہ گیارہ بارہ بجے تک محفل جمی رہتی، جوٹھے ہاتھ سوکھ کر جھڑ جاتے پھر بھی کسی کا جی پلنگ پر جانے کو نہیں چاہتا"۔ اُن کے احباب بھی ان کی گفتگو کی بذلہ سنجی، زندہ دلی اور خوش مذاقی کے قائل تھے، ان کی صحت ہمیشہ خراب رہی، آخر میں اُن کی قوت گویائی بھی ختم ہوگئی تھی، اُن کی بیوی کو اُن کی ضد اور چڑچڑاہٹ سے شکایت رہی، مگر انھوں نے ان کے ساتھ جس وفاداری سے زندگی بسر کی، وہ ایک افسانہ کا موضوع بن سکتا ہے، اُن کے کوئی اولاد نہ تھی، مگر وہ اپنی سوگوار بیوی کے دل و دماغ پر اپنی یادیں اس طرح چھوڑ گئے ہیں، کہ ع:-

(ص۔ع)

مخملیں سبزے پہ جیسے برگِ گل کی ہو پھوار

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

اس میں عہدِ مغلیہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی دلچسپ اور دلخوش کن داستان تاریخ کے مستند ماخذوں اور حوالوں سے پیش کی گئی ہے،

قیمت ۵-۰-۱

"منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

بیاضِ مریم:- از سکندر علی وجد ضخامت ۱۳۶ صفحے، کاغذ و طباعت عمدہ، ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی قیمت: بارہ روپے،

جناب سکندر علی وجد اردو کے مشہور اور مایۂ ناز شاعر ہیں، جو کسی تعارف کے محتاج نہیں، اس وقت اُن کی عمر تقریبًا ۶۴ سال کی ہوگی، پہلے حیدرآبادی تھے، اب مہاراشٹری ہیں، ۱۹۱۴ء میں بیجاپور ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، جو اس وقت نظام حیدرآباد کی ریاست میں شامل تھا، اب یہ مہاراشٹر میں ہے، عثمانیہ یونیورسٹی میں تعلیم پائی، سشن جج کے عہدہ پر فائز رہے، پنشن پانے کے بعد کسی حال میں اپنے کو معمر اور بوڑھا سمجھنے کے لئے آمادہ نہیں ہوئے، عروس سخن سے ہمکنار رہ کر اپنے طوفان جوانی کی موجوں کو یاد کرتے رہے، اسی لئے اپنی ایک غزل میں کہتے ہیں،

وہ نقشِ حسیں غزل سراپا ہر خط میں رواں رواں لہو ہے

اپنی شاعری پر یہ کہکر تبصرہ کیا ہے،

وجد کرتا ہے کچھ ایسی باتیں پیکرِ صدق و صفا ہو جیسے

ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں:-

وجد ہر شعر حسن کا پیکر شاعری ہے کہ حسن کاری ہے

اپنی خاکساری میں یہ بھی کہہ گئے ہیں، ع

ع :۔ قتیلِ حسنِ سخن وجد کس شمار میں ہے،

مگر اب تو ان کا یہ درجہ ہے کہ کسی کو اپنی صف میں شمار کر لیں، تو اس کے لئے باعثِ فخر ہو۔

ان کے خیال میں شاعری کا یہ معیار ہے،

فکر کی آگ میں بنتا ہے سخن حرفِ پرسوز دعا ہو جیسے،

شاعری وہ ہے کہ دریاؤں کے نام کوہساروں کی صدا ہو جیسے،

غزل کی یہ تعریف کی ہے،

تخیل کو تکلّم دینے والے، غزل، عکسِ رُخِ جانانہ ہو جائے،

اسی کو دوسرے انداز میں کہتے ہیں،

اے وجد یہی ایک ہے تعریف غزل کی تصویرِ دل آویزیِ اندازِ محبت

یہ بھی کہتے ہیں :۔

ہر غزل بنتی ہے شمشیرِ دو دم حسن اور گلزاروں کے بیچ

ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

وہی دراصل غزل ہے جس میں تیغ و پازیب کی جھنکار ملے

یعنی ان کو غزل میں لہو ترنگ اور جل ترنگ دونوں کی تلاش ہے، اس کو یہ درجہ دیا ہے،

وجد اردو کی آبرو ہے غزل یہ نوازش ترے وطن کی ہے،

زیرِ نظر مجموعۂ کلام سے پہلے اُن کے تین مجموعے لہو ترنگ (سنہ ۱۹۴۳ء)، آفتابِ تازہ (سنہ ۱۹۵۲ء) اور اوراقِ مصور (سنہ ۱۹۶۲ء) میں نکل چکے ہیں۔ ان کا چوتھا مجموعہ بیاضِ مریم کے نام سے سن ۱۹۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے متعلق خود ہی کہتے ہیں،

کہکشاں ہے کہ بیاضِ مریم جگمگاتے ہوئے اشعار ملے،

اس میں اُن کی غزلیں بھی ہیں، نظمیں بھی، اور کچھ ایسے اشعار بھی ہیں، جو قوافی اور ردیف کی پابندی سے آزاد ہو کر لکھے گئے ہیں،

اُن کی غزلیں سہلِ ممتنع کی بہت اچھی مثالیں ہیں، ایسے آسان لیکن پر کیف اشعار ایک قادر الکلام شاعر ہی کہہ سکتا ہے،

کانٹوں میں جو ہنس رہا ہے پیہم وہ پھول چمن کی آبرو ہے،

آئینہ رُخوں کی بے نیازی اے وجد حجابِ آرزو ہے،

یوں تجھے یاد کیا کرتا ہوں تو مجھے بھول گیا ہو جیسے

باخبر بن کے کیا ہوا حاصل کام آئی یہاں تو بے خبری

ہجر میں اور کچھ تو کر نہ سکے ہم نے تاروں سے شب کی مانگ بھری

آنسو ہی نہیں پردہ دررازِ محبت خاموش تبسّم بھی ہے غمّازِ محبت

حسن اک پھول کھلا ہوا جیسے عشق خاموش چتا ہوا جیسے

جو مروّت میں مرنے کو تیار ہے کیا کرے گا محبت اگر ہو گئی

کچھ غزلیں قدیم اساتذہ کے رنگ میں بھی ہیں، سودا کے رنگ کی جو غزل ہے اس کا ایک شعر یہ ہے،

عمر بھر ہر زخمی تیرِ نظر بے خطر پھرتا ہے تلواروں کے بیچ

غالب کے انداز میں جو غزل کہنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کا ایک شعر یہ ہے :۔

موت سے ہم نے جیت کر بازی — زندگی دوستی میں ہاری ہے

ان غزلوں میں کبھی کبھی سیاسی خلش کا بھی اظہار ہوگیا ہے، مثلاً

انھیں اب ستا کے کریگا کیا انھیں اب مٹا کے کرے گا کیا،
وہ جو کل تلک تھے جہاں پناہ تری پناہ میں آگئے
کوئی کچھ تو کہہ نہ سکا مگر ہوئی عام جبر کی ہر خبر
ترے ظلم و جور کے حادثے مری ایک آہ میں آگئے

کہیں کہیں عارفانہ رنگ کے بھی اشعار ملتے ہیں،

ترے جلووں میں جو گم ہوگیا ہے — خبر ہے کچھ تجھے اس بے خبر کی،
اپنی دنیا ہے الگ اپنے زمانے سے جدا — حیرت انگیز مکاں اور زماں اور بھی ہیں
علم نے یوں تو بہت عقدۂ مشکل کھولے — رازِ گنجینۂ فطرت کے نہاں اور بھی ہیں
تیری دوری سے ہے خالی خالی — وقت بے برگ و نوا ہو جیسے

اس مجموعہ میں مارلن منرو، پھلواری، مہاتما گاندھی، اندرا گاندھی، اور صبحِ شالامار، وغیرہ پر نظمیں ہیں، صبحِ شالامار اُن کی قادرالکلامی کا بڑا عمدہ نمونہ ہے، اس میں محاکات کی بڑی اچھی مثال ملتی ہے، اس کے کچھ اشعار یہ ہیں:-

موجِ صبا نے صحنِ چمن میں — لہرائے پھولوں کے پرچم
ہلکی ہلکی نرم ہوائیں — ہلکے بادل، بارش کم کم
ساقی مہوش جوشِ طرب میں — بخش رہا ہے، دولتِ بے غم
لرزاں ہے جاں بخش لبوں پر — حرفِ تمنا، مبہم مبہم،
شوق نہیں محفل میں تنہا — حسن و جوانی مونس و ہمدم

اہلِ جنوں فردوس بداماں — اہلِ خرد فی نارِ جہنم

وہ غزل خوانی اور نظم گوئی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ راہِ زندگی سے گذر کر آوارہ لمحوں کو بھی ڈھونڈتے ہیں، اس لئے کبھی کبھی اپنے رنگ سے ہٹ کر کچھ ایسے اشعار اور نظمیں بھی کہہ جاتے ہیں جن میں قافیہ اور ردیف کی پابندی نہیں ہوتی، اسی کا ایک نمونہ "من کا پھول" ہے،

اس مجموعہ کی خوبی یہ ہے کہ شاعر نے اس کی کتابت خود کی ہے جس طرح نجی طور پر لکھتے ہیں، اسی طرح پورے مجموعہ کی کتابت کردی ہے، جہاں ان کی شاعری سے ان کے خیالات و جذبات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، وہاں اُن کی شانِ خط سے بھی اُن کی طبیعت کا مطالعہ ہوسکتا ہے، خط بہت ہی صاف ستھرا اور پاکیزہ ہے جس سے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اُن کی طبیعت میں صفائی ستھرائی اور پاکیزگی ضرور ہوگی،

مجموعہ میں حسین آرٹسٹ نے اُن کے بعض اشعار کو اپنے آرٹ کی روشنی میں دکھانے کی کوشش کی ہے، اس کی خوبی آرٹسٹ ہی کی نظر میں دکھائی دے گی، عام ناظرین کو اُن کے سمجھنے میں اپنی بصارت اور بصیرت دونوں کو آزمائش میں مبتلا کرنا پڑتا ہے،

وجد صاحب کا ایک مقطع ہے،

جنونِ وجد کی دلکش حقیقت
بہت ممکن ہے اک افسانہ ہوجائے

یہاں جنون سے مراد اُن کی شاعری ہے، امید کہ اُن کی شاعری اک افسانہ نہیں بلکہ ایک حقیقت بن کر رہے گی،

......٭......

مطبوعاتِ جدیدہ

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ۔ مرتبہ جناب محمد ایوب صاحب قادری، متوسط تقطیع، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۶۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳۶ روپے۔

پتہ ۔ پاک اکیڈمی ۱۴۱ وحید آباد، کراچی ۱۸

جناب محمد ایوب قادری، پاکستان کے بہت مشہور اہل قلم اور مصنف ہیں، ہندوستان کی تاریخ اور گذشتہ علماء سے متعلق مستقل تصنیفات لکھ کر اور فارسی میں ہندوستان کی بعض اہم تاریخوں کے ترجمے اور کچھ نایاب مخطوطات کو ایڈٹ کر کے علمی حلقوں میں امتیازی حیثیت حاصل کرلی ہے، ان کا قلم بڑا رواں دواں ہے، اس لیے بہت جلد کسی کتاب کے مصنف یا مترجم ہو جاتے ہیں، زیر نظر کتاب میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے احوال و کوائف نو ابواب میں بیان کیے گئے ہیں، انگریزوں نے اس جنگ کو غدر کے نام سے موسوم کیا، اور ان کے زمانہ میں اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں مصلحت کی بنا پر محبان وطن کی سیرت و کردار کو مسخ اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا، آزادی کے بعد صحیح نقطۂ نظر سے کتابیں لکھنے کا رجحان پیدا ہوا تو اردو اور انگریزی میں متعدد اہم کتابیں شائع ہوئیں مگر ابھی مزید کام کی ضرورت ہے، ۵۷ء سے متعلق قدیم تحریریں اور دستاویزیں برابر مل رہی ہیں، اور ان سے نئے حقائق معلوم ہو رہے ہیں، اس کتاب کی یہ اہم خصوصیت ہے کہ اس میں اس طرح کے دستاویزوں اور تحریروں سے بڑی مدد لیگئی ہے، اور بعض کو بعینہ مع ترجمہ نقل بھی کیا گیا ہے، ابھی تک جو کتابیں شائع ہوئی ہیں،

ان میں سے اکثر کا تعلق کسی خاص خطے اور شخص سے تھا، مگر اس کتاب میں مختلف علاقوں اور اشخاص کی سرگرمیوں اور جدوجہد کی سرگزشت بیان کی گئی ہے، پہلے باب میں بطور تمہید ۵۷ء میں ہونے والے واقعات کا پس منظر بیان کیا گیا ہے، اس میں پہلے مفتی محمد عوض کے مختصر حالات اور بریلی میں برطانوی استبداد کے خلاف جہاد کا ذکر ہے، پھر سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین اور اس کے نامور اشخاص نیز وہابی تحریک اور ہنومان گڑھی (اجودھیا) کے واقعات درج ہیں، دوسرے باب میں روہیل کھنڈ کے اضلاع کے حوادث اور پانچویں باب میں وہاں کے آخری معرکوں کی داستان بیان کی گئی ہے، تیسرے باب میں دوآبہ گنگ و جمن کے اور چوتھے میں اودھ و کانپور کے واقعات قلمبند کئے ہیں، چھٹے اور ساتویں باب میں دہلی مرحوم کی تباہی کے المناک حالات وغیرہ ہیں، آٹھواں باب ۵۷ء سے متعلق نادر تحریروں اور قیمتی دستاویزوں اور نواں باب سولہ اہم مجاہدین کے ولولہ انگیز حالات اور کارناموں پر مشتمل ہے، ہر باب میں قلمی کتابوں کے اقتباسات ترجمے کے ساتھ شامل ہیں، آزادی کے متعدد سورماؤں کے فوٹو اور بعض قلمی تحریروں کے عکس بھی دئے گئے ہیں، اس سے ۵۷ء کے واقعات و اشخاص کے علاوہ اس زمانہ کی علمی و ادبی کاوشوں کا پتہ بھی چلتا ہے، لائق مصنف نے جزائر انڈمان و نکوبار کے بعض جلاوطنوں کی علمی خدمات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، مگر اسکو ساتویں باب "سقوط دہلی، (۲)" میں خلط ملط کر دیا ہے، حالانکہ اس کا ایک علٰحدہ باب میں اور زیادہ تفصیل سے تذکرہ کرنا چاہئے تھا، بعض واقعات و اشخاص کے ذکر میں تکرار بھی ہو گیا ہے، ایک جگہ قصبات کی طرح شہرات (ص ۳۰۸) لکھ گئے ہیں، اس سہو قطع نظر کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، امید کہ یہ شوق سے پڑھی جائے گی۔

چند تحقیقی مقالے ۔ از پروفیسر سید حسن صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۹۲، قیمت مفت، ناشر کتاب خانہ بانکی پور، پٹنہ

یہ پروفیسر سید حسن سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی کے مندرجۂ ذیل تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے، (۱) لکھنؤ، سوا سو برس پہلے، (۲) لکھنؤ کے چند نامور شعرا ایک پرانے روزنامچے کی روشنی میں (۳) آتش سے نجات حسین خان صاحب کی ملاقات (۴) نالۂ عشاق (۵) بہار کا ایک گمنام مصنف مولوی حسن علی (۶) اردو ادب میں کرشن بھگتی کی روایت (۷) اخبار الپنچ بانکی پور کا پہلا سال، یہ مضامین پہلے مختلف رسالوں میں چھپے تھے، اول الذکر تین مضامین پٹنہ کے ایک صاحب ذوق ادیب و شاعر نجات حسین خاں کے ایک قلمی روزنامچہ "سوانح لکھنؤ" کی مدد سے لکھے گئے ہیں، وہ گذشتہ صدی کے وسط میں امجد علی شاہ کے دور میں چہلم دیکھنے کے لیے عظیم آباد سے لکھنؤ آئے، یہ روزنامچہ اسی سفر کے مشاہدات و تاثرات پر مشتمل ہے، پروفیسر سید حسن نے پہلے مضمون میں اس کی مدد سے لکھنؤ کی رنگا رنگ زندگی کا مرقع پیش کیا ہے، اس میں وہاں کے بازاروں، دوکانوں، میلوں اور چہلم کے جلوس، اس زمانہ کے سیاسی، معاشرتی حالات اور اشیائے خوردنی کے نرخ وغیرہ کا ذکر ہے، دوسرے میں خانصاحب نے اس زمانہ کے معروف شعرا آتش، دبیر، انیس، ضمیر، اور برق وغیرہ سے اپنی ملاقات کے علاوہ انکے حالات و کمالات بھی اجمالاً تحریر کئے ہیں، تیسرے میں آتش سے ملاقات کا مفصل ذکر ہے اس میں انکے بارہ میں بعض ایسے معلومات بیان کئے ہیں جو عام تذکروں میں نہیں ملتے، چوتھے میں انیسویں صدی میں پٹنہ سے شائع ہونے والا ایک ماہنامہ اور ساتویں میں وہیں کے اخبار "الپنچ" کے خصوصیات دکھائے ہیں اور مضمون نگاروں کے نام بھی تحریر کئے ہیں، ان سے گذشتہ صدی میں عظیم آباد کی ادبی و صحافتی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے، پانچویں مضمون میں مولوی حسن علی کے حالات اور ادبی کارناموں پر بحث کیگئی ہے، چھٹا مضمون زیادہ اہم ہے اس میں بھگتی تحریک کا مختصر جائزہ لیکر اسکے اردو ادب پر اثرات کا مفصل ذکر ہے یہ مضامین مصنف کے پختہ و نکھرے ذوق کا ثبوت اور دلکش طرز تحریر کا نمونہ ہیں جو ارباب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہیں۔

غالباً کتابت کی غلطی سے ایک جگہ جواصلاً مونث اور "دود" کے بجائے دار دورہ (ص ۹۳) لکھ گیا ہے، ذکی ماہرانہ تحریر میں اسم کی جمع "رسومات" (ص ۹۳) بھی تعجب خیز ہے،

"ض"

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی و تحقیقی و ادبی و تنقیدی و تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے علاوہ جو مطالعہ و بصیرت تجربہ و مشاہدہ اور فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں، شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات و تراجم کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔

۱- مہاجرین جلد دوم قیمت: ۹-۱۲

۲- سیر الصحابہ جلد ۶ " ۴-۹

امام حسین کے حالات زندگی کے ضمن میں واقعۂ حزنیہ کربلا کی غم انگیز تفصیل،

۳- سیر الصحابہ جلد ۷،

۴- تابعین: ۶۹، اکابر تابعین کے سوانح،

قیمت: ۵۰-۱۲

۵- تاریخ اسلام اول (عہد رسالت و خلافت راشدہ)

قیمت: ۵۰-۱۲

۶- تاریخ اسلام دوم (خلافت بنی امیہ) ۰۰-۱۱

۷- تاریخ اسلام سوم (خلافت عباسیہ اول)

قیمت: ۰۰-۱۴

۸- تاریخ اسلام چہارم (خلافت عباسیہ دوم)

قیمت: ۰۰-۱۵

۹- اسلام اور عربی تمدن قیمت ۶۵-۱۵

۱۰- عرب کی موجودہ حکومتیں،

قیمت

۱۱- ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲- دین رحمت قیمت ۰۰-۱۰

۱۳- خریطۂ جواہر ۷۵-۴

زندگی کی آخری کتاب

۱۴- حیات سلیمان: یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی و ملی، سیاسی حالات، واقعات اور کارناموں کا دلآویز مرقع، اور اپنے اسلوب و طرز انشا اور تحقیق کے لحاظ سے حیات شبلی کا ثانی، دلکش، دلچسپ، قابل مطالعہ، اسمیں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے، قیمت: ۵۰-۲۷